"دادا کہتے ہیں زندگی مائیگرین کے درد جیسی ہے۔ ادھر راحت ......ادھر اذیت۔ خوشی اور دکھ ساتھ ساتھ۔ مگر دادا یہ بھول جاتے ہیں کہ کچھ "پورے درد" والے بھی ہوتے ہیں۔ دکھ ملا تو پورا......خوشی ملی تو مکمل۔ مگر اپنے اپنے غموں کو بھوگتے روح شل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تھکن ہے جسے میں اب تک کوئی نام نہیں دے سکا۔"

گود میں دھرا کتابوں کا ماؤنٹ ایورسٹ۔ جیل روڈ کی مصروف ترین شاہراہ۔ وہ مسافر خانے کے شیڈ تلے بیٹھا اپنے ساتھی سے کہتا۔

"تھک گئے ہو؟" ساتھی کی مسکراہٹ۔ وہ نظر انداز کرتا۔

"تمہارے دادا کا فلسفہ کسی کام نہیں آنے والا۔ بس آ گئی ہے اٹھو اور گھر چلو...... دعوت کا انتظام کرتا ہے ابھی۔" ساتھی کی مسکراہٹ نے ترغیب دلائی۔

وہ زنجیر کرتی تھکن کو پاؤں میں روندتا بس میں سوار ہو گیا۔

☆☆☆

اخروٹ کی لکڑی کی مخصوص باس والا وہ گھر پرسکون ہواؤں میں گھرا تھا۔ بالائی منزل کے کونے والے کمرے میں خوب صورت فانوس ہر شے کو منور کیے ہوئے تھا۔ نک سک سے تیار ایک وجود منقش لکڑی کے پلنگ کی پائنتی پہ ٹکا تھا۔

"زیادہ سے زیادہ تین دن لگ سکتے ہیں مجھے

نازیہ رزاق

ایک خواب بتا کوئی

دنیا کے ایس بڑے سوشل سائنٹسٹ (سماجی سائنسدان) کانفرنس میں شرکت کر رہے ہیں۔ پھر ایک انٹرویو دینا ہے بی بی سی واشنگٹن میں۔ جلد لوٹ آؤں گا۔ آپ اپنے فزیوتھراپسٹ سے تعاون کیجیے گا۔" وہ جھکا۔ پلنگ پر چت لیٹے وجود کے ماتھے پہ بوسا دیا۔ تبھی اخروٹ کی لکڑی پہ پاؤں کی دھمک پڑی۔

"سر! فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔" اسکاٹش سکریٹری نے سرخ و سفید چہرے اور پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ڈیوڈ کہاں ہے؟" اس نے پرسنل اسسٹنٹ کا پوچھا۔

"اس کی وچ نما آنٹی نے کل رات نیند میں چلتے ہوئے سیڑھیوں سے گر کر ٹانگ تڑوالی ہے سر۔ اس کی چھٹی کی درخواست آئی ہوئی ہے۔"

"اوہ...... یہ تو بری خبر ہے۔ لیانا! آپ کچھ رقم بھجوا دینا ڈیوڈ کو ہیری فائل لائے گا وہ سنبھال لینا اور ان کا خیال رکھنا۔" وہ گھر سے نکلا تھا۔

کینیڈا کی ریاست ورمک شائر کا خوب صورت قصبہ جو سیاحت کے لیے پوری دنیا میں جانا جاتا تھا۔ اس قصبے کا سب سے کامیاب کاروباری شخص تھا وہ۔ کینیڈا کی تمام ریاستوں کے سیاحتی مقامات میں ریسٹورنٹس کی چین چلانے والا وہ شخص تھا جس کے واسطے یہ کہانی بنی گئی۔

☆☆☆

"ایڈم! تمہارا ناشتہ ادھورا کیوں ہے؟" بالوں میں سجے رولرز کو ہاتھوں سے سیٹ کرتی وہ چودہ سالہ بیٹے سے مخاطب تھی۔

"یہ ناشتے، ڈنر میری توہین میں کمی نہیں لا سکتے۔" وہ چیخا۔

"میرے بھائی توہین، نام والوں کی ہوتی ہے...... سو یو ڈونٹ وری۔" یہ برنٹی تھی۔ تیرہ سالہ، سیاہ فام۔ گھنگھریالے بالوں میں ہیڈفونز ٹکائی، ابلا انڈا کھاتی وہ ایڈم کو زہر لگتی۔

"ماما، ہمیشہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بلسی جانتا تھا وہ مجھے تین ہفتوں سے اِگنور کر رہی ہے پھر کیوں؟ میرا ہی دوست کیوں؟" وہ بیٹے کا کندھا سہلانے لگی۔

"میں دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ (گالی) لڑکی۔" وہ غصہ ہوتی اٹھ کھڑی ہوئی ایڈم کو کھلایا۔

"میرا خیال ہے میں نے تم لوگوں کو آزاد زندگی گزارنے کی اجازت دی ہے مگر کسی لڑکی کو گالی دینے کی ہرگز نہیں۔ اگر ان فضول سرگرمیوں کے بجائے کچھ وقت اپنی کتابوں کو دے سکو تو تمہاری ماں کو کچھ پل سکون مل جائے گا۔"

مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکلتی ہوئی درمیانے برآمدے کی سیڑھیوں تک آئی۔ ایڈم اور برنٹی پریشان ہوئے۔ سیڑھیوں کے پاس کھڑے باقی چاروں بھی متوحش ہوئے۔

"گاڑی میں بیٹھو...... میں بیگ لاتی ہوں۔" اسکول کے لیے تیار کھڑے بچوں سے کہا۔ کمرے تک گئی بیگ اور چابیاں لائی۔ سیڑھیوں کے پاس ایڈم کھڑا تھا۔

"معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ پورچ تک پیچھے آیا۔

"میں نے کہا، معافی چاہتا ہوں۔" وہ رکی۔ نیویارک سٹی کا سورج اپنی کرنیں اس کی سبز آنکھوں میں سجانے لگا۔

"اپنی معذرت کی وضاحت کر سکتے ہو؟ یہ معذرت مجھ سے ہے یا پھر اپنے برے رویے سے؟" وہ چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھتا سرخ ہوا۔

"جو آپ کہو۔" ماں کو معتبر کیا۔

"اپنا رویہ درست کرو۔ تمہاری ماں کو یہ الفاظ دہرا کے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

وہ آگے بڑھا اور ماں سے لپٹ گیا۔ چار سالہ جیمز بھی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ یوں جس کو جہاں جگہ ملی وہ اس کے وجود سے منسلک ہو گیا۔ سامنے والے بنگلے

کے مسٹر اوکلے اور ان کی بیٹی حیرت زدہ اس محبت کے مظاہرے کو دیکھتے رہے۔

☆☆☆

"سنگاپورین رائس کسی طرح مس نہ ہوں۔ یاد تو ہے ناں؟" برف سی یخ آواز نے اس کی پشت میں سوراخ کرتے ہوئے ہڈیوں کے گودے میں اپنی جگہ بنائی۔ "یاد ہے ناں؟" والا جملہ ہر بار اس کی اوقات کا تعین کرتا۔

اس نے پین کو تیزی سے گھما کر سبزیوں کی جگہ بدلی۔ اور کچھ بدلے نہ بدلے ان کی تو جگہ بدلے۔

"جی بس تیار ہیں۔"

"اس کا ٹیکسٹ آیا تھا ایپل کیک کی فرمائش کی تھی۔ حسن کو بہت پسند ہے۔" اس نے تھکن کو خود میں چھپن چھپائی کھیلتے پایا اور سر ہلا دیا۔

"بس چاکلیٹ کوٹنگ باقی ہے۔"

"چاکلیٹ سے یاد آیا میں نے تمہیں آلمنڈ چاکلیٹ بنانے کو کہا تھا کل؟" وہ منرل واٹر کی بوتل کو منہ لگاتے ہوئے بولیں تو دل غیر معمول ہوا۔

جواب میں تاخیر ہوئی اور فوراً محسوس کی گئی۔

"کیا تم ہماری زندگی کو تھوڑا سہل نہیں کر سکتے؟ کیا یہ ایک غلط مطالبہ ہے تمہارے اس ماموں کے لیے جنہوں نے خود کو مشین ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی..... صرف اس گھر کے لیے مگر تمہیں کیا..... تمہاری بلا سے۔ گھر جانے گھر والے جانیں ٹوہیل ود دس منحوسیت۔"

وہ میک اپ زدہ چہرہ تھپتھپا کے گہری سانس بھر کے جوتوں کی آواز پیدا کرتی کچن سے نکل گئیں۔

وہ ہاتھ کی رفتار بڑھاتا رہا۔

یہ رئیس خان زادہ کی اکلوتی ممانی تھیں۔ بڑے جتنوں سے قابو کیا ہوا فربہی مائل وجود۔ بڑی بڑی قدرے باہر کو ابلتی آنکھیں، پھیلی سی ناک باریک ہونٹوں اور ناک کا درمیانی فاصلہ غیر معمولی۔ بڑے اور کھلے مساموں والی زردی جلد اور بادامی رنگ ڈائی زدہ بال۔ انسانوں کے ایسے گروہ سے تعلق رکھتیں جو خود کو "میں" سے شروع کر کے "میں" پہ ختم کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ بات اچکنے میں ماہر ہوتے ہیں..... ان کے ہوتے کسی بات کا کریڈٹ کوئی اور لے ہی نہیں سکتا۔

"ارے فریال! تمہارے بیٹے نے اپنے پلس لیا ہے۔ مبارک ہو۔ ویسے تم لوگوں کی فیملی میں تو اوولیول میں یہ اسکور بہت ہے۔ خیر میری امی کے ماموں کی پوتی نے پچھلے سال جونیئر کیمرج میں ڈسٹنکشن (امتیاز) لی تھی اور میں نے اپنی....." وہ میں کی کہانی کئی گھنٹوں سنا سکتے ہیں۔

وہ سوچوں کو مات دیتا پھر سے جلتے چولہوں پہ دھرے پکوانوں سے الجھنے لگا۔

یہ سلسلہ بھی جانے کب شروع ہوا..... کب وہ ان نیلے پیلے شعلوں سے روشناس ہوا۔ ہاں یہ تب کی بات ہے جب ماں کا انتقال ہوا اور وہ گیارہ سال کی عمر میں پردیسی باپ سے مایوس ہو کر ننھیال چلا آیا۔ نانا حیات تھے، ماموں بیوروکریٹ۔ شروع میں وہ اپنی خالی خالی آنکھوں سے ہر شے کو تکتا رہتا۔ یونہی سال گزر گیا۔ تب گرمیاں تھیں اور ممانی کا کک اپنے گاؤں..... گندم کی کٹائی کو گیا مگر لوٹ کے نہ آیا۔ ممانی برتنوں پہ غصہ نکالتیں، جیسے تیسے کرتیں۔ ایک دن پچھلے کچن کی سیڑھیوں پہ کتاب پڑھتے رئیس سے بولیں۔

"دال اتار لینا اور بگھار کا مسالہ تیار کر دینا۔ دائیں والے کیبنٹ سے چاول بھی نکال دینا میں ماسٹر بی کی طرف سے ہو کر آئی۔"

وہ خود کو گھسیٹتا کچن میں لایا۔ سب آرام سے کیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ مسالوں کی دکانوں سی سوندھی سوندھی خوشبو۔ نرم گرم سا ماحول۔ اس کی آنکھیں رسنے لگیں۔

"مما.....!" اسے وہ یاد آئیں جو کسی بچے کو کبھی نہیں بھولتیں۔ یہ ماحول سارے گھر سے جدا تھا۔ اپنا اپنا سا۔

وہ اٹھا اور چیزوں سے چھیڑ چھاڑ کے بعد ڈرتے ڈرتے چاول بنا ڈالے۔

سمیعہ ممانی آئیں تو سب کھانا کھا چکے تھے۔ پھر وقت کی بے قابو لہروں نے جانے کہاں کہاں سے راستے بناتے اسے یہاں لا پٹخا۔ اب گھر سے خانساماں کو رخصت ہوئے بھی آٹھ سال ہو چکے تھے۔ وہ ہر شے اس ہنر سے بناتا کہ...... کہ فرعون کے محل کے باورچی بھی اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں مگر نقل بھی نہ بنا پائیں۔ پہلے پہل تو ممانی نے سب کے سامنے تعریف میں کوئی کسر نہ چھوڑی...... مگر جیسے جیسے اس کی غیر معمولی مہارت اور لذت کا ڈنکا بجنے لگا سمیعہ ممانی نے مورچہ بدل لیا۔

"رئیس! ٹیبل لگانے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ ہر شے بنا کسی ترتیب کے۔ اگر آپ نے پڑھائی سے جان چھڑانے کو یہ تلوار ہمارے سروں پہ رکھی ہے تو پھر نبھانا تو خوش اسلوبی سے ہی چاہیے ورنہ لوگ تو ہمیں ہی الزام دیں گے کیوں مسز قیوم؟" وہ جو کچھ پھلنے پھولنے لگا تھا...... واپس سمٹنے لگا۔

رفتہ رفتہ یہ بات ہر طرف تسلیم کی جانے لگی کہ وہ پڑھائی سے بچنے اور تعریفیں بٹورنے کو سب کرتا ہے۔ ماموں نے اسکول تبدیل کروا دیا۔ ممانی نے ایک ڈائری تھمائی۔

"ہر دن کے خرچے کا لفظ لفظ گوشوارہ بنا کے رات کو دکھایا کرو۔"

"تمہارے دادا نے پاکٹ منی نہیں بھیجی؟ دراصل اس ماہ ہاتھ کچھ تنگ ہے تو......" ماہانہ فیس سے ہاتھ کھینچ لیا گیا۔

دادا نے پتا چلنے پہ رقم زیادہ بھیج دی تو......

"کیا ہر بات پہ لوگ مجھے کسی جادوگرنی کی طرح دیکھا کریں گے...... الزام دیا کریں گے مجھے جس نے اس کے سر پہ تب ہاتھ رکھا جب سگا باپ بھی اسے بھولے، دوسری شادی رچائے ورلڈ ٹور پہ تھا۔ کیا کہیں گے لوگ۔ سب کو جواب تو مجھے دینا ہے۔ خاندان میں سو وہ تو مجھے کرنا ہے۔"

سمیعہ ممانی نے رو رو کر تمھیں سنبھالیں... بٹھالی۔ نتیجتاً دادا کی نانا سے سخت بحث ہوئی۔ وہ چلے گئے۔ نانا نے اسے پیسے گنتے دیکھا تو اکڑ گئے۔

"ظفر خانزادہ کا پوتا...... تڑپا تڑپا کے زندگی کے دن تھماؤں گا تمھیں جیسے میری بچی کو اس گھر میں ملے۔" وہ حیران رہ گیا۔ مگر وقت اسے حیران کرنے میں تیز رفتار نکلا اور وہ عادی ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

"کیوی میرا فوکس شاٹ لو ذرا۔ مسام زیادہ کھلے تو نہیں لگ رہے۔ دراصل کل مساج کے بعد مسام بند نہیں کروائے...... مصروفیت۔"

"شارلٹ تمھیں میں نے مواد کی نقل لانے کو کہا تھا تاکہ جلدی معائنہ کروانے کو۔" وہ قدرے بھاری آواز میں تحکم سے بولی۔ شارلٹ کیمرے، لائٹس کی تاروں سے الجھتی منزل کو پہنچی۔ وہ ہاتھوں کو بار بار مسلتی۔ زندگی نے اپنا دائرہ مکمل کر کے اسے وہاں پہنچایا تھا کہ حیران ہونے میں بھی وقت لگ رہا تھا۔ تین کافی کے مگ اوپر تلے چڑھا کے بھی دماغ کی ٹیسیں کم نہیں ہو رہی تھیں۔ بہترین دوائیاں یوگا کے آسن بھی سرخ پپوٹوں کی سوجن سے مقابلے میں ناکام تھے۔

"نجانے کیوں کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ انسان ہونے سے زیادہ انسان رہنا مشکل ہے۔" پیپل کے پتوں سا بجتا دل لیے وہ قریب آتے لمحوں کو خوف سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

"دادا نے بتایا ابن خلدون نے افراد کو تین بڑے گروہوں، اشرافیہ اعتدالیہ اور غربا میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن دادا کے ناقص العقل پوتے نے یہ ڈھونڈا ہے کہ ایک اور بڑا گروہ بھی ہے "آرذالیہ" ایسے لوگ کچھ نہیں ہوتے۔ کسی گروہ میں سفر نہیں کرتے۔ معاشرے کے کسی درجے پہ نہیں پہنچتے۔"

اگر اس وقت یہاں دادا ہوتے تو کہتے۔

"ایسے لوگ ہی تاریخ کے زاویے درست کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی ہوتے ہیں جو غیر مرئی روشنائی سے تاریخ کائنات میں اپنا نام رقم کر جاتے ہیں۔"

دادا کو مجھ میں امید نامی بھوسا بھرنے کا شوق ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ ہے ناں؟"

وہ کھانے کو ڈش آؤٹ کر رہا تھا جبکہ سبز و خاکی لباس والا وجود کاؤنٹر پہ بیٹھا مسکرائے جاتا۔

"جب تم تھک جاتے ہو ناں رئیس خان زادہ! تو تمہیں دادا کا سارا فلسفہ کسی پیٹ بھرے کے سامنے دلیے کا پیالہ ہی لگتا ہے۔ امید کو خود سے باندھے رکھنے کا اجر تمہیں ہی ملے گا۔"

"اگر تم اپنے ہفتہ وار مونو راگ (ہم کلامی) سے فارغ ہو جاؤ تو ٹیبل لگانا شروع کر دو۔ مہمان انتظار میں ہیں۔" شاہ میر نے کچن کے دروازے میں خود کو بمشکل روک کر اس پر طنز کیا اور چل دیا۔ کاؤنٹر پہ بیٹھا وجود ٹھٹکا۔

"شاہ میر کو میں کبھی نظر نہیں آتا۔" خالد کچن میں آیا۔ رئیس نے میز لگائی ہر شے میں ترتیب اور خوش اسلوبی کو بھایا۔

ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ ماموں زاد انابیہ اور اس کا شوہر اعزازی کرسیوں پہ بیٹھے محو گفتگو تھے۔ مصنوعی باتیں، مصنوعی مسکراہٹیں۔ ایلیٹ کلاس کی ایسی محفلوں میں بناوٹ سب سے آگے نظر آتی ہے کہ دور تک اس کے پیچھے، جبکہ مسالہ دار غیبتیں سب سے پیچھے مگر سب سے زیادہ گھاتک۔

ممانی کو کھانا لگنے کا بتایا۔ مڑا تو دیکھا مسز کرنل کی آمد ہوئی۔ مسز کرنل ماموں آفتاب پراچہ کے کزن کی بیوی تھیں۔ بنگلہ اسی لین کے کونے پہ تھا۔ انسانوں کے ایسے گروہ سے تعلق رکھتی تھیں کہ تجسس کی کثافت پسندی انہیں کسی حد تک نفسیاتی بیمار بنا چکی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اگر جنگل میں اکیلے بھی چھوڑ دیے جائیں تو وہ جنگلی حیات کو ڈسپلن کی کلاسیں دینا شروع کر دیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی سے ہاتھ بھی ملائیں تو نورا ٹشو پیپر سے صاف کریں گے۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر بستر ٹٹولتے اور اس میں کوئی کمی ڈھونڈھ کر رہتے اور رفع کرنے کے لیے کوارٹرز میں سوئے ملازموں کو زحمت دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ ایسے لوگ میز پہ چھری کانٹے کی ذرا سی اول بدل پہ چونک چونک جائیں گے۔

"ہیلو رئیس.....! کیسے ہو؟ میں لیٹ تو نہیں۔" وہ رئیس پہ مہربان تھیں۔

"بالکل بھی نہیں مسز کرنل۔ آپ کیسی ہیں؟"

"فائن بیٹا..... اس سے ملو یہ میری پوتی ہے....."

"اسے کچھ کھانے کو دے دو تو مہربانی ہوگی۔" وہ لڑکی جسے مسز کرنل نے متعارف کروانے کی اپنی سی کوشش کی تھی، اس کی گود میں اپنی رشین بلی دے رہی تھی۔

رئیس نے اب کے لڑکی کو دیکھا۔ پنڈلیوں تک آتی جینز پہ گرے رنگ کی، ہیلووین کی ٹی شرٹ۔ پاؤں میں جاگرز شکل سے امریکن لگتی۔ گہری سبز

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

آنکھیں برف سی شفاف رنگت۔ بے تحاشا گھنگھریالے بمشکل کندھوں تک آتے بال اور سرخ کانوں میں ہیڈ فونز لگائے چیونگم چباتی وہ لڑکی جیسے مسز کرنل پہ احسان کر رہی تھی۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے مگر وہ پیروں کو جھلا کر اور منہ کو ہلا کر عجب بے نیازی سے صوفے پہ براجمان تھی۔

وہ مسکرا کے پلٹ گیا۔ نذیر کو بلا کر بلی کو کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد فرمائشی کافی کا دور چلا۔ وہ کافی سرو کر رہا تھا، وہاں عکاشہ بھی نظر آئی۔ ماموں کی دختر نمبر دوم۔ کراچی میں رہتی تھی۔ دوسرے درجے کی اداکارہ تھی۔ آج کل کسی بڑے پروجیکٹ کے لیے کوشاں تھی۔ آج کی نسل کے اس گروہ سے تعلق رکھتی تھی جو میری زندگی میرے اصول کے موٹو پہ یقین رکھتے ہوئے بڑی سے بڑی غلطی بھی جسٹ ایڈونچر کے نام پر کر سکتے ہیں۔ فی الحال اس کی زندگی میری فٹنس سے شروع ہو کر میری اسٹائلنگ تک ہی محدود تھی۔ جب سترہ سال کی تھی تو کسی پہ کرش ہوا تھا۔ ناکامی بھی ہوئی۔ نتیجتاً خودکشی کی کوشش بھی کر لی۔ تب سے سب اس کی شخصیت سے گھبرا گئے تھے۔

"مائے گاڈ..... آئی ہیولاسٹ مائے نیکلس اوور ہیئر۔" (میرے خدا۔ میں نے اپنا ہیروں کا ہار یہاں گم کر دیا) یہ انابیہ کی روہانسی پکار تھی۔ سب بوکھلائے۔ مختلف آوازیں گونجنے لگیں۔

"رئیس! ادھر دیکھو ذرا۔" اشارہ صوفے کے نیچے تھا۔ سب اپنی جگہوں سے کھڑے ادھر ادھر جھانکنے لگے صرف وہ لڑکی بیٹھی پیر جھلاتی رہی۔

"وہ میرا ویڈنگ گفٹ تھا..... حسن کی امی ناروے سے لائی تھیں۔" انابیہ کی آواز نم تھی۔

وقت گزرنے لگا۔ نیکلس ہنوز گم شدہ است۔ انابیہ کا شوہر اسے تسلیاں دے رہا ہے۔ وہ بے آواز آنسوؤں سے رو رہی ہے۔ سمیعہ آنٹی کا بی پی لمحہ بہ لمحہ اوپر اٹھ رہا ہے۔ رات تیسرے پہر میں داخل ہوئی تو سمیعہ آنٹی سب سے معذرت کرنے لگیں سب اجازت چاہنے لگے۔ مسز کرنل نے بمشکل ماتھے کے تیور درست کیے اور اٹھیں۔

"اوکے سمیعہ..... ہم چلتے ہیں۔ کرنل صاحب ڈنر سے آ کے سو بھی گئے ہوں گے۔ یہ شان مست انابیہ سے کوئی لاپروائی ہوئی ہے۔ یہیں کہیں ہو گا نیکلس مل جائے گا۔ اوکے انابیہ! اب رونا تو بند کرو۔"

مسز کرنل کی پوتی شرٹ ٹھیک کرتی اٹھی اور رئیس کی نگاہیں برف ہوئیں۔ مسز کرنل کی پوتی کی جھک کے آخری کونے سے جھانکتا نیکلس۔

مسز کرنل لاعلمی سے نیکلس مل جانے کی دعائیں دے رہی ہیں۔ پوتی نیکلس لیے نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے اور رئیس ابھی تک برف کا ہوا کھڑا ہے۔ یہ ان کا پہلا تعارف تھا۔

☆☆☆

اس دن اسکول میں میری استاد نے ہمیں ملٹن (Milton) پڑھایا تھا اور ملٹن کی شاعری میں کسی لیوائتھن (Leviathan) نامی بلا کا ذکر ہوا بہت بڑی سمندری بلا.....

اس وقت میں تکونی شیشے کی ہی کھڑکی سے ناک چپکائے، بالائی منزل پر بنے اپنے کمرے سے، سڑک پہ بھکاریوں سے گھومتے جھومتے اندھیرے کے سمندر، میں اس بلا کو ڈھونڈھنے میں سرگرداں تھی۔ نچلی منزل سے دیواروں، راہداریوں میں دراڑیں ڈالتی آوازیں سارے میں گونج رہی تھیں۔

آتش دان میں پڑی لکڑیاں تک آواز سے ہول رہی تھیں۔ دائیں جانب بنے اوپن کچن کے چولہے پہ دھری چائے اب افریقا کے کالے جادو سا رنگ بدل چکی تھی۔ آوازیں مسلسل اور پرزور تھیں۔ باہر اندھیرے کے سمندر میں لیوائتھن اپنی دیوقامت پونچھ، سارے بنگلوں کی کھڑکیوں پہ مارتا پھر میری کھڑکی میں آ کے چنگھاڑتا۔

"ہاں ہاں..... ذلیل عورت! جب قسمت میں کالک ہی لکھی تھی تو پھر بھرے نیویارک میں مجھے روشنی کہاں نظر آتی..... اگر آ جاتی تو میں تم پہ تھوکتا بھی ناں۔"

"ہونہہ...... بے غیرت گیدڑ تم صرف عورتوں کے پیچھے دم ہی ہلا سکتے ہو یا زیادہ سے زیادہ زبان...... تھوکنے کی ہمت تو تمہیں اس زندگی میں کبھی نصیب نہ ہوگی۔" وقت کسی بدمزہ فلم کے دوران جیسا...... سستی دکھاتا، خراماں خراماں سرکتا۔

"جب اس چکاچوند نیویارک میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے تو وہ میں ہی تھی جس نے یہ غلاظت بخوشی اپنی جھولی میں سمیٹی۔"

آوازیں مزید کریہہ ہو گئیں۔ لیو اتھن مسلسل ڈکراتے ہوئے، پہلو بدلتا میری کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے دیکھنا چاہا۔ جلا ہوا...... ادھڑا ہوا، کٹا پھٹا بدن۔ کسی خونخوار ڈریگن سا دھڑ، کسی اژدھے سی دم اور آواز...... اف۔ یہ مسلسل ہتھوڑا ہوتی آوازیں۔

"تمہارے اس عاشق..کے ساتھ گزارے لمحات میں نے ہی اپ لوڈ کیے تھے۔ آخر کو دنیا بھی جان لے میرا ظرف...... صبر کی انتہا۔"

سامنے والی کھڑکی کھلی اور ایک چہرہ ہیری پورٹر کا شاندار پریمیئر دیکھ لینے سا تجسس لیے لان کی جانب جھلتی کھڑکی پر نگاہیں جما بیٹھا۔ لیو اتھن دانت نکوسنے لگا۔

"اور تمہاری ہیلن آف ٹرائے کا بوٹا کس سیشن میں نے ہی اسپائل کیا۔ اب پھرے گی چھ ماہ تک ٹیڑھے ہونٹ اور اکڑی بھنویں لے کر۔"

اب کھڑکی میں فٹ ہو کے بیٹھا وجود، ٹیبلٹ کھڑکی سے باہر کے مناظر قید کرنے لگا۔ لیو اتھن جیسے دھمال ڈالنے لگا۔

"تم کتیا۔"

"تم کمینے......" لیو اتھن وجد میں آ کے میری کھڑکی میں گھس آیا۔ میرے ننگے پاؤں لکڑی کے فرش پر پسینے کے نشان چھوڑتے آگے بڑھے۔ سیڑھیوں کی ریلنگ سے نیچے جھانکنا، مجھے برج خلیفہ سے فلپائنی کھائی میں جھانکنے جیسا ہی لگا تھا۔

"آہ......" ممی نے شیشے کا گلدان ڈیڈی کے سر پہ مارا تھا...... اوہ کتنا نفیس اور مہنگا گلدان تھا وہ۔

ماہنامہ
حنا
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور
جنوری 2021 کا سال نو اور سال...
نمبر شمارہ شائع ہو گیا ہے
جنوری 2021 کے شمارے کی ایک...
ہر گھر کے لیے ماہنامہ حنا
☆ "جب عمر کی نقدی ختم ہونی" یادداشت...
☆ "بیتی یادوں کے سائے" سال نو اور سالگرہ کے موقع پر مصنفین سے سروے،
☆ "پس آئینہ" فرزانہ حبیب کا مکمل ناول،
☆ "تم میرے ہو" نورین معشوق چوہان کا مکمل ناول،
☆ "تیرے عشق کی پڑگئی مار پیا" افشاں علی کا مکمل...
☆ "قربت ھجر میں محبت" ندا حسنین کا ناولٹ،
☆ "مزاق عاشقی دارم" ایلا طالب کا ناولٹ،
☆ ثناء کنول، تحریم ابدال، زارا بخاری، ام قحشی اور سندس جبیں کے افسانے،
☆ "امید صبح" ام مریم کا سلسلے وار ناول،
☆ "اسیر عشق" سدرۃ المنتہیٰ کا سلسلے وار ناول کی آخری قسط...
اس کے علاوہ
پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشا...
نامہ اور حنا کے تمام مستقل سلسلوں کے علاوہ...
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں اسے...
پڑھ کر اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کیجیے
جنوری 2021 کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کر...

لیو اتھمن میری پشت پہ پھنکارنے لگا یوں کہ اس کی شعلے سی سانسیں میری پشت چھیدنے لگیں۔ خوف نے کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح مجھ میں جگہ بنائی۔

پھر ڈیڈی نے...... ڈیڈی نے پودوں کی کانٹ چھانٹ والی قینچی سے ممی کے ڈیڑھ بالشت جتنے بال کاٹ ڈالے...... اف، چھوٹے بالوں میں ممی بالکل اچھی نہیں دکھتیں۔ لیو اتھمن کہیں غائب ہوا۔ فضا پرسکون ہوگئی۔ میں واپس مڑی۔ نرم گلابی لحاف کو خود پہ طاری کیے میں نے مخصوص سائرن کا انتظار بڑے دل سے کیا۔ طویل وقفے کے بعد لوسی آنٹی میرے کمرے میں آئیں۔ مجھے یہ اطلاع دینے کہ آج کی شب وہ میرے ہمراہ رہیں گی...... کیوں؟ یہ میں جانتی تھی۔ وہ فون پہ مصروف ہوئیں۔

"اب دونوں کو علیحدہ ہوجانا چاہیے...... آخر کب تک میٹروپولیس کے دفتر میں راتیں گزاریں گے۔" اداسے بال سہلاتیں تو ہیرے کی انگوٹھی چمکتی۔ نیند دماغ کے خانوں کو تالے ڈالنے لگی۔

اگلے دن سہ پہر میں ممی اپنا سامان اٹھائے، میرا بازو دبوچے ڈیڈی کو اپنے جانے کا بتا رہی تھیں تب لوسی آنٹی اپنی انگوٹھی ڈھونڈنے کے واسطے اس بکھرے ہوئے گھر کو مزید بکھیر رہی تھیں۔

میں پرسکون تھی کہ میرے گلابی چھوٹے کراس بیگ میں ایک چمکتی شے کا مزید اضافہ ہوچکا تھا۔ اس اضافے کو تکتی میں اپنی زندگی میں در آنے والی کمی کو محسوس نہ کرپائی۔

☆☆☆

اسے ذائقوں سے کھیلنے میں مزہ آتا تھا۔ پہلے پہل جو کام وہ مجبوری سے کرتا تھا۔ اب وہ اس کام کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ دنیا کی ہر ترکیب آزمانے کو تیار رہتا۔ خراب ہونے پر نام بدل کے موجد کا روپ دھار لیتا۔ جیسے رس ملائی گھل گئی تو کسٹرڈ میں ملا کر الگ ڈیزرٹ بنالیا۔ وقت گزرا...... چاکلیٹ چپس اور فروٹ کیک کی ٹاپنگ کردی پھر ڈرائی فروٹ ملایا تو وہ ذائقے کی حسوں کو چونکا دینے والی ترکیب بن گئی۔

ہائی کورٹ کے جج، ماموں کے کلاس فیلو تشریف لائے۔ ڈیزرٹ کے ایسے عاشق ہوئے کہ اگلے دن خانساماں کو سیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ ایسی مسکراہٹ ابھی دل میں گھمسن گھیریاں ہی ڈال رہی ہوتی کہ سمیعہ آنٹی میٹھا سا بول جاتیں۔

"چلو کسی کام کا تو ہے۔"

کچھ جملے بولنے میں کتنے ہلکے ہوں...... سینے میں موت جیسے ہوتے ہیں۔ ایسے جملوں سے گھٹنے لگا دن بدن...... تھوڑا تھوڑا۔

خیر...... ماموں کے چھوٹے بیٹے اذہان کو بھی ڈیڈی میٹرل کی طرح چاکلیٹ پسند تھی۔

رئیس، سمیعہ آنٹی کی مسکراہٹ کے لیے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد آلمنڈ چاکلیٹ بنا پایا۔ ثابت بادام کے اوپر ایک انچ چاکلیٹ کی تہہ۔ اذہان اس دن صوفے پہ قلابازیاں کھاتا رہا۔ شاہ میر بھی ذرا متاثر ہوا۔ ماں بولی۔

"چاکلیٹ اوور گولڈ (زیادہ پکی ہوئی) گئی ہے۔"

"بچے کیا؟" والے انداز میں دیکھنے لگے۔ پھر یاہ اذہان کے لیے دو کلو بادام چاکلیٹ بننے لگی۔ زندگی تھکن سمیٹنے میں جیسے جت گئی۔

شاہ میر کو سوشی پسند تھی تو وہ جھینگوں کو سیدھا کرنے کے جتنوں میں لگا رہتا۔ عکاشہ ڈائٹ کونشس تھی تو وہ ڈائٹ سوپ اور سلاد کو لذیذ سے لذیذ تر کردینا چاہتا۔ اولیولز میں بمشکل چار سو تیس نمبر کا ٹیلا بنا سکا۔

سمیعہ آنٹی نے دیکھا میں نہ کہتی تھی کہہ کر ہاتھ جھاڑ لیے۔

"نانا نے...... نسل ہی ایسی ہے۔" کہہ کر جان چھڑالی۔

"ماموں نے...... دیکھ لو آگے کیا کرتا ہے۔" بول کر ذمہ داری نبھالی۔

اور وہ ایک بار پھر اسٹور روم میں بچھے سنگل بیڈ پہ سر جھکائے بیٹھا ایڑیوں کے تلوؤں سے اٹھتے درد کو

دباتا رہا۔

"آہ، یہ تھکن....."

☆☆☆

"سب متوجہ ہوں..... تیس سیکنڈز میں ہم آن ایئر جانے والے ہیں۔" شارلٹ نے تالی بجا کر سب کو چوکنا کیا۔

مہمان بے ساختہ اپنا ہاتھ ٹائی تک لے گیا اسے ڈھیلا کیا۔ پھر وہ ہاتھ منرل واٹر کی بوتل تک گیا ہے۔ میزبان ہلکی کپکپاتی آواز کے ساتھ ابتدائی الفاظ بول رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ "زمین" نامی سہارے کا ہر حصہ کچے پھل کی طرح خلا میں جھڑ گیا ہے۔ صرف یہی منظر بچا ہے کہ جس میں دو کرسیوں کے درمیان سیپیوں سے بنا میز، ایش ٹرے، کانسی کا مدہر مجسمہ یہی ایک حصہ سو کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے گھوم رہا ہے ایسے جھکڑ کی صورت جو کچھ بجھائی نہیں دینے دیتا۔

میزبان اعتماد کو سمیٹتے ہوئے اس کی کامیابیوں کی فہرست درجہ بدرجہ بمع تواریخ سب کو ازبر کرانا چاہتی ہے۔ گھوڑے کے الگ دو اٹھے پیروں میں پھنسے طویل قامت گھڑیال نے الگ اپنا راگ بھیروی چھیڑ رکھا ہے..... ٹک ٹک ٹک زمین اس حصے کو اٹھائے گھوم رہی ہے۔ گھڑیال بھی مستقل مزاج ٹک ٹک ٹک اب وہ دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے خود کو اس چکر کے سپرد کر دینے والے ہیں۔

یہ وقت میں چاہے آگے لے جائے چاہے پیچھے۔

☆☆☆

"تم زندگی میں غلطیاں کرنے سے ہمیشہ ڈرتے ہو اور غلطیاں دہرانے سے تو قطعی طور پہ..... پھر اس لڑکی کے لیے اپنے اصول توڑنے کا مطلب؟ پچھلی بار کا بھول گئے؟"

ڈرائی فروٹس کی چوپنگ کرتے رئیس کے ہاتھ تھمے۔

"خدارا کچھ دیر کے لیے چپ رہو۔ تمہیں خبر ہونی چاہیے کہ میں جلدی میں ہوں۔ مجھے یہ ڈیزرٹ آنٹی کی دوست کو بھجوانا ہے۔ پھر ماہا انتظار کر رہی ہوگی اور وہ جلد ناراض ہونے والوں میں سے ہے۔"

آئس کریم باؤل میں تہہ جماتے وہ جھنجھلا بھی رہا تھا۔

"ایسی جلدی تم نے اپنے اندر بھی مچا رکھی ہے رئیس خان زادہ..... کچھ دیر کو تھم کیوں نہیں جاتے۔ اس ماہا کے علاوہ کوئی اور انتخاب بھی رکھ سکتے ہو نظر میں۔"

رئیس نے چونک کر کاؤنٹر پہ جھکے اس بے نیاز بارہ تیرہ سالہ وجود کو دیکھا جو پچھلے صحن میں کھلتی کھڑکی کو ترچھی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ رئیس نے اس کی نظر کی پیروی کی۔ کرنل صاحب کی بوٹی، املی کے درخت سے لٹکے ٹائر پہ سر نیچے کیے ٹانگیں اوپر دھیرے، دھیرے دھیرے جھول رہی تھی۔

رئیس نے سر جھٹکا۔ وقت اس کے گرد گھوما۔ کسی ماہر بیرے کی طرح ایک منظر سامنے لا دھرا۔

اس دن دعوت پہ..... اس نے دیکھا، انابیہ کا نیکلس..... جانے کیوں وہ چپ رہا۔ اسے اس لڑکی سے خوف آیا۔

دو دن بعد..... گملوں کی ہفتہ وار صفائی کے دوران۔ اس نے سنی پیادہ فوجوں کے پیروں کی سی دھمک اور افراتفری۔ وہ اوپر کو بھاگا۔ مسز کرنل زرد ہوئی ٹیرس کو دیکھتیں۔ ملازم بھاگ رہے تھے۔ کرنل صاحب دھاڑ رہے تھے۔ گہری سبز آنکھوں اور اسپیکھٹی سے سرخ بالوں والی خوب صورت لڑکی اپنی کٹی پھٹی جینز اور کھلے گلے والی شرٹ میں بازو کھولے ٹیرس پہ کھڑی تھی۔

"یہ تو کیٹ سے بھی اوپر کی چیز ہے باس۔ ٹائی ٹینک والوں سے مجرمانہ غلطی ہوئی ہے۔ اسے نہ لے کر۔"

اذہان کی آواز کہیں سے کان میں آئی۔ اور وہ خوب صورت چہرے والی نے خود کو ٹیرس سے نیچے لڑھکا دیا۔

سب نے چیخنا چاہا اور کامیاب ہوئے۔ ہوا میں لڑکی کے وجود نے زاویہ بدلا اور دائیں طرف کے سوئمنگ پول میں جا گری۔

سب کی سانس بحال ہو ہی جاتی گر وہ سطح آب پہ آ جاتی۔ وہ پیندے میں پڑی تھی۔ ملازم پھر سے

متحرک ہوئے۔ لڑکی کے ہونٹ نیلے ہوئے۔ ہاتھ پاؤں حرکت میں آئے۔ ملازموں نے بمشکل باہر نکالا۔ تو کیا یہ خودکشی کی کوشش تھی؟ مگر کیوں؟

بھلا اتنی اچھی شکلیں، ماں باپ کی بے تحاشا دولت بھی مرنے دیتی ہے۔ ہر کوئی اپنی راہ چل دیا۔

ساری لین کے ملازموں نے اجلاس کیے۔ چٹخارے بھی لیے۔ بیگمات کے لیے اتنی کشش نہ تھی۔

"توجہ بٹورنے کے نوجوانوں کے طریقے۔"

وہ سب چونکیں جب اگلے ہفتے وہ جنت سے نکالی گئی حور سی لڑکی، ٹیرس کی ریلنگ میں پاؤں پھنسا کر سر نیچے لٹکائے مرنے کے قریب ہوگئی۔ آنکھیں خون رنگ...... چہرہ خون جمنے سے داغ زدہ۔ پچیس منٹ تک وہ یونہی لٹکی رہی تھی مزید لٹکی رہتی اگر ملازم نہ دیکھ لیتا۔ رئیس کو اس سے مزید خوف آیا۔ کوئی اتنا بہادر بھی ہوسکتا ہے؟ بے وقوفی کی حد تک...... بہادر۔"

رئیس سر جھٹک کے "حال" میں لوٹا۔ ہولے سے بڑبڑایا۔

"کوئی اور چوائس؟ دادا کہتے ہیں کہ کم از کم محبت کرتے ہوئے انسانوں کی طرح چوائسز نہ دیکھو...... صرف تعمیل کرو اور اس کے معجزے دیکھو۔ فرشتوں کی طرح۔ ویسے بھی وقت میرے لیے چوائس تو رکھتا ہی نہیں۔"

"تو رئیس خان زادہ کے مطابق اسے ماہا ادریس سے محبت ہے۔" کاؤنٹر سے چھلانگ مار کر وہ اس کے پہلو میں آن رکا۔

"کم از کم آثار تو یہی ہیں۔" رئیس نے گردن ڈھلکا کر تنقیدی نظروں سے ڈیزرٹ باؤل کو دیکھا۔ پھر چاکلیٹ کوکیز کی ترتیب جمانے لگا۔ خالد آگیا۔

"رئیس بھائی! بیگم صاحبہ گاڑی میں بیٹھ گئی ہیں۔"

رئیس جلدی سے ہاتھ چلاتا۔ ڈیزرٹ کیبنٹ میں رکھنے لگا۔ صفدر کو روانہ کیا۔ بچے ہوئے آمیزے سے ماہا کے لیے باؤل تیار کرنے لگا۔ وہ سرور آگیں آواز میں قرآن پڑھنے لگا۔ باؤل پکڑ کے جانے کو مڑا...... قدم رکے نگاہ مڑی اور دکھ سے بھر گئی۔

لڑکی کا ٹائر سے نیچے لٹکا سر سارا خون آنکھوں میں دھکیل بیٹھا تھا۔ اتنی اذیت پسندی وہ [illegible] کون سا دکھ ہے جو اس کی نسیں چھید رہا ہے؟ کون سا لمحہ ہے جو اسے جینے نہیں دیتا؟ وہ سبز پوشاک والے بزرگ سے املی کے درخت کی طرف بڑھتے اپنے قدم روک نہ پایا۔

"السلام علیکم مس ہالہ......!" وہ جھٹکے سے [illegible]

آواز اسے پاگل کرتے شور کی دنیا سے غلام گردش میں لائی تھی۔ گہری خاموشی...... پرندوں کی سرگوشیاں تھیں کا سفر...... خزاں جوبن پہ تھی۔ ہر جگہ پتے اور ٹہنیاں ہوا کے عشق میں پاگل اس کی پیروی پہ قائم۔

سیاہ ٹراؤزر گرے فل سلیو شرٹ...... سیاہ سویٹر چہرہ بھی لباس سا...... یعنی عام۔

"وہ میں یہ آپ کے لیے لایا تھا۔ میٹھے میں شفا ہے۔ یہ دل کو سکون دیتا ہے تب ہی اللہ نے جنت کی سب سوغاتیں میٹھی رکھی ہیں۔ یہ آپ کو یقیناً اچھا لگے گا۔"

ہالہ اسے دیکھتی رہی۔ "کون ہو تم؟" الفاظ سانپ کی سرسراتی پھنکار سے، آنکھیں سرد خانے میں دھری لاش سی...... یعنی منتظر۔

رئیس خان زادہ لفظی تیراندازی کا مشّاق تو کبھی نہ رہا تھا۔ اب تو مقابل بھی تقریباً بہرہ تھا۔

"جی...... وہ، وہ میں۔" ہونٹ چپک چپک گئے کہ وہ تو کچھ نہ تھا۔

"جاؤ، یہاں سے بدتہذیب انسان!" فرعون سا لہجہ...... وہ پلٹ گیا۔ املی کے تنے کے ساتھ باؤل دھرا تھا اور جھولا پھر سے رواں تھا...... سبک سا۔

☆☆☆

اس دن میں امریکن سٹی سنٹر اسکول کی عالی شان پتھریلی عمارت کے ستون سے ٹیک لگائے، اپنا گلابی بیگ گود میں دبوچے بیٹھی تھی کہ نخریلے امیر زادوں کا ٹولہ قہقہے لگاتا میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑا ہوگیا۔ اور ان سب کا باپ......

"دوستو...... ویڈیو تو تم لوگ دیکھ ہی چکے۔ اب

بتاؤ اس ''ممی کم ذومبی'' سے تعزیت کی جائے ..... یا تعزیت ہی کی جائے۔'' ٹیڑھے میڑھے ہیر اسٹائلز، آدھے ادھورے لباس والے ''ہالی وڈ پیسز'' قہقہے لگانے لگے۔

''چہ چہ چہ..... مجھے ہمدردی ہے تم سے اور تمہارے پیرانارمل والدین سے بھی۔'' میں خود کو دیکھ نہیں سکتی تھی مگر یہ محسوس کر رہی تھی کہ میرے بدن کا سارا خون ہولے ہولے میرے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔

''اچھا کیا تھا وہ..... ہم م م م..... ذلیل عورت آہ..... آؤچ۔'' وہ اداکاری کرتا اس کے قریب سیڑھیوں پہ ڈھیر ہوا۔ اپنے اسنیکرز سے اس کی پنڈلی مس کی۔ وہ سمٹی۔

''اب میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ کل کون سا منہ لے کر آفس جانا۔'' ہاتھوں کی ملامتی قینچی سے اس کے سرخ گھنگھریالے بال کاٹنے لگا اور قینچی اس کے بالوں میں پھنسا بیٹھا۔ نکالنے کے چکروں میں اس کے بال بری طرح بکھرے۔ اس کے دوستوں کے قہقہے بھی۔ مجھے لگا میری پتھر آنکھیں پھوٹ پڑیں۔

''مجھے اکیلا چھوڑ دو..... ڈینی۔'' میں پنجوں پہ زور دے کے اٹھی۔ ننھا گلابی بیگ اس کی گرفت میں آ گیا۔

''ڈیسٹیل کلارتھ کہو..... اسنو وائٹ۔ ابھی ہم اتنے بے تکلف نہیں۔''

''ڈینی ڈیئر..... اس کی مام کیسے جبڑے نچا نچا کر بولتی ہیں؟'' سارہ پیٹرسن نے اس کی جیکٹ پہ انگلی پھیرتے، لاڈ سے فرمائش کی۔

''اوہ ہاں.....'' وہ بھی جوشیلا ہوا۔

''ذیک کتے..... میں تمہاری اس پلی کو لے جا رہی ہوں۔ بھونکنے سے فارغ ہو جاؤ تو آ کر لے جانا ورنہ کسی گاڑی کے نیچے دے ڈالوں گی اسے۔''

وہ ممی سے بھی زیادہ ممی لگا تھا مجھے۔ میں آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانپتی اندھا دھند بھاگی۔ گلابی بیگ..... میرا خزانہ اس شیطان کی ہتھیلیوں میں دبا رہ گیا۔ رات میں کلارا کے سامنے ڈٹ گئی۔

''میں اب اس اسکول کبھی نہیں جاؤں گی۔''

گھٹنوں تک آتی اسکرٹ پہنے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے گردن اکڑائے نیوزی لینڈ کی مہنگی ترین کافی کے کپ چڑھاتے اپنے ٹوٹے رشتے کا سوگ مناتی کلارا ذیک نے مجھے حیرانی سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

سمیعہ کو اس کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور نہ ہی رئیس سے دشمنی کی کوئی وجہ ہی نظر آتی..... مگر وہ رئیس کو دیکھتے ہی عجب تناؤ کا شکار ہوتیں اور یہ تناؤ وہ کسی بھی طرح رئیس میں بھرنا چاہتی تھیں۔

اولیولز کے بعد رئیس نے عام سے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور سادہ مضامین پڑھنے لگا۔ سمیعہ آنٹی نے ہر خاندانی تقریب میں پیشن گوئیاں داغنی شروع کر دیں۔ وہ کڑھنے لگا..... گھٹنے لگا۔

ایک دن آنٹی نے شاہ میر کے دوستوں کے سامنے، کان مروڑتے ہوئے اسے ڈرائنگ روم سے باہر نکالا اور سرونگ کا حکم دیا۔ وہ ٹوٹ گیا۔ اس ساری رات اسٹور روم میں سسکیاں گونجتی رہیں۔ اگلے دن دادا کو فون کر دیا۔

''مجھے آپ کے پاس آنا ہے دادا۔'' دادا نے دوسری بات سننے سے پہلے فون بند کر دیا۔ اس نے پہلی بار بدمزہ کھانا بنایا۔

''کیا میں ابا کو کال کروں؟'' وہ تین دن تک خود سے مباحثے کرتا رہا۔ پھر نانا اس کا ٹکٹ لے آئے جو دادا نے بھیجا تھا۔ وہ ہر دکھ بھول گیا۔ اذہان بولا۔

''کیا آپ اب کبھی نہیں آؤ گے؟''

وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔ سب کے چہروں پہ طنز بکھرا اور وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔

☆☆☆

اس کے سامنے بیٹھی وہ بڑے پروفیشنل انداز میں اس کی کامیابیوں کی فہرست گنوا رہی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھتا تھا۔ کندھوں تک آتے سنہرے سیدھے بال۔ نیلگوں آنکھیں۔ اٹھتے کناروں والے ہونٹ، فارمل ڈریس اپ۔ ہاتھ میں پکڑے پین کو ہیجانی انداز میں صوفے سے ٹکراتی وہ عوام کو اس کی زندگی

کے وہ گوشے بھی دکھا رہی تھی جو اس کی نظر سے بھی شاید ہی گزرے ہوں۔ وہ حیران ہوتا۔ کیا یہ سب واقعی وہ ہے؟

دنیا کے چند سوشل سائنٹسٹس میں سے ایک...... سماجی فلاسفر، مہنگا ترین پروفیسر، کامیاب بزنس مین۔ آہ...... آنکھوں میں چبھن ہونے لگی۔ تو بالآخر وہ "کچھ" ہے۔ وہ حال میں لوٹتا ہے روشنیاں ویسی ہی چکا چوند ہیں اردگرد لوگ ویسے ہی متحرک۔ وہ سامنے پڑے لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلاتے اب سوالات کی اجازت چاہ رہی تھی۔ پہلا سوال کرتی ہے۔

"اتنی کامیابیاں...... فلسفے میں اتنا نام، میٹافزکس میں شاندار کامیابی کیسا لگتا ہے؟"

"معذرت چاہتا ہوں مجھے کبھی نہیں لگا کہ میں کوئی نامی فلاسفر بن گیا ہوں۔"

فلاسفر کوئی بھی نہیں بننا چاہتا۔ آر۔ دنیا کے ہر بچے سے پوچھ لیں کوئی ایک بھی نہیں ہے گا کہ وہ فلاسفر بننا چاہتا ہے...... تو پھر ایسے گمنام عہدے پہ زعم کیسا؟...... ہاں "کچھ" بننا ہمیشہ سے چاہا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو نا کام ہے تو اس بات نے میرے حوصلوں کو کھینچ کر مزید طول دیا۔"

وہ مسکرایا تو وہ بھی مسکرائی...... لاجواب ہوئی پھر اگلا سوال پوچھا۔

"آپ ہمیشہ یہ کہتے نظر آئے کہ انسان کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ...... منطق اور معقولیت کی غلط پہچان ہے...... کیسے؟ وضاحت کریں گے؟"

ہوا کے سپرد ہوتی ان آوازوں سے دور کسی نے اس سوال کے جواب کو "نتیجے" کے ہیجان سا سنا تھا۔

☆☆☆

اس دن عکاشہ کی دوستیں آ گئیں۔ ایسی دوستیں جو دوست کا کھلا کھلا گلابی رنگ دیکھ کر بے ساختہ کہتی ہیں۔

"اوہ یار! کیا ہوا؟ تم اتنی پیلی پیلی سی کیوں ہو رہی ہو؟ ٹھیک تو ہو جانی؟"

اور دوست اچھی بھلی سے یرقان زدہ ہو جائے۔ ایسی دوستوں کے لیے کھانا بنا کے وہ ابھی

اپنے ٹھکانے پر پہنچا ہی تھا کہ نانا چلے آئے۔

"اوئے کھوتیا۔ آج کل تو تھوڑا بچے کی طرح کچھ زیادہ ہی نہیں کر رہا، میرے سارے جوتے تک (ختم) گئے۔ پالش تیرا ابا کرے گا یا دادا؟" اپنے سامنے خود میں سانپ سی پھنکارتی ٹھکن کو صبر کی انتہا سے پیٹ کے نانا نے کہا۔

"میں قطعی بھول گیا تھا۔ معذرت چاہتا ہوں نانا۔ ابھی کر دیتا ہوں۔"

نانا ___ حسب روایت "ہونہہ" کہہ کر لان کی جانب چل دیے۔ اس نے جوتے اکٹھے کیے اور پچھلے صحن کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔

خزاں کا موسم آئے دو چاند ہو چکے تھے اور سرما ہلکی انگڑائیاں لیتا بیدار ہونے کو تھا۔ درخت پرانی پوشاکیں اتارنے کی تیاریوں میں تھے اور کچھ ابھی مزاحمت دکھاتے تھے۔ وہ آلتی پالتی مارے جوتے چمکانے میں ساری توانائیاں لگا رہا تھا۔ لب حسب عادت خودکار طریقے سے ہلنے لگے۔

"تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا۔" (الزلزلۃ آیت 8-7)

"کون ہو تم؟ اور یہ ابھی کیا بول رہے تھے؟" مسز کرنل کی باڑھ کے پار وہ موتیے کی مورت نگاہیں مرکوز کیے کھڑی تھی۔

"میں بول نہیں رہا تھا۔ تلاوت کر رہا تھا قرآن کی۔" رئیس نے دوسرے سوال کو پہلی ترجیح پر رکھا۔

"مسلمانوں کی پاک کتاب؟" وہی امریکن لب ولہجہ۔ ہاتھ سے باڑھ ہٹا کے وہ چند قدم آگے آئی۔

"ٹھیک ہے، مگر اس کا مطلب کیا ہے؟" وہ وضاحت کرنے لگا۔

جینز کی جیبوں میں ہاتھ گھمائے، جاگرز سے پتے مسلتی رہی۔ بنا کوئی تاثر دیے مگر وہ تندہی سے وضاحت کرتا رہا۔ شاہ میر ادھر آن نکلا۔

"رئیس...... او پیارے...... ذرا جان لگا مجھے

کوئلہ نہیں چمکتا کاربن سا جوتا پہننا اچھا لگتا ہے۔ سمجھ گیا اصغری بیگم اور کبھی وارڈ روب کے پیندے بھی کھنگال لیا کرو ورنہ سمندری کائی لگ جاتی ہے وہاں تیری وجہ سے۔"

سکندر اعظم سی رعونت لیا لہجہ۔ وہ تھا بھی اتنا ہی شان دار۔ رب نے جس سانچے میں اسے بنایا تھا۔ وہ سانچہ تو پھر توڑ ہی ڈالا ہوگا تب ہی کوئی ایسا نہ دکھتا۔ سی اے کے فائنل ایر میں تھا۔ ذہانت تو شخصیت کی دربان تھی۔

"میں..... کردوں گا۔" شاہ میر کی نظریں اٹک گئیں۔

"اوہیلو..... مس ہالہ کیسی ہیں؟" ہالہ نے قطبین سی سرد آنکھیں موڑیں۔

"یہ..... وہ شاہ میر....." رئیس نے تعارف چاہا۔

"میں تم سے کچھ کہہ رہی تھی۔" شاہ میر خفت سے پلٹ گیا۔

"مجھے یہ کہنا تھا کہ تمہاری آواز میں کچھ ہے..... کچھ ایسا جو بہت سی آوازوں میں مجھے چونکا گیا ہے..... جیسے جیسے..... مجھے نہیں معلوم....." وہ شہتوت اور سنبل کے پتوں پر پاؤں دھرتی واپس مڑ گئی۔ پتوں کے مسلنے سے آواز ابھری۔ سرگوشیوں سی آواز..... جیسی ہمالیہ کی کوکھ میں پلتی وادیوں میں قیامت خیز زلزلوں سے پہلے ابھرتی ہیں۔ سرگوشیاں ہوا کے ذروں کو پھلانگتے ہوئے اس تک آئیں۔ بانہیں اس کے گرد ڈالیں۔ بائیں جانب سے اس کی پشت پر لپٹ گئیں۔

ہونٹ اس کے کان سے لگائے۔

"خبردار رہنا..... خبردار....." وہ کندھے جھٹک کر سرگوشی سے آزاد ہوا۔ مڑ کر ساتھ بیٹھے وجود کو دیکھا۔

"میرے پاس تو کھونے کو کچھ بھی نہیں۔ پھر کیا خبردار رہنا۔" وجود میں ہنسی پھوٹی۔

"دادا کہتے ہیں ناں وقت کھونے کو کچھ نہ کچھ جھولی میں ڈالے ہی رکھتا، چاہے وہ کوئی تسلی..... کوئی دلاسا..... کوئی خواب ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے خود کو کبھی خالی ہاتھ نہ سمجھنا۔"

وہ مڑ کے اسے دیکھتا رہا۔ سنبل اور شہتوت کھونے کو نیا وجود تیار کرتے رہے..... نئے بچے.....

☆☆☆

نیا اسکول، نئے چہرے..... کچھ نئی ابتدا۔ سٹی سینٹرل کے شیطان اپنی شکلیں لیے گم ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ زندگی ایسی ہول ناک بھی نہ تھی، جتنی میں تصور کیے بیٹھی تھی۔ جتنا میں اسے محسوس کرتی تھی۔ میرا محسوس کرنا بھی عجیب تھا۔ مجھے بڑی بڑی باتیں محسوس نہ ہوتیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں مجھ میں پیوست ہو کے رہ جاتیں۔

میں اپنے ماں باپ کی خودغرض بے حسی پر سر جھٹک کے ویڈیو گیم کھیل سکتی تھی مگر کھڑکی پر بچے مارتی بھوکی بلی..... مجھے سرد ترین راتوں کو مرکزی دروازے سے باہر لا کھڑا کرتی۔ ویسے ہم سب انسان ہی ایسے واقع ہوئے ہیں۔ ہم اپنے کمرے کے سب سے ناقابل توجہ کونے میں پڑے بھدے اور بوسیدہ گل دان کا پانی جگہ سے ہلنا محسوس کرلیں گے مگر ایک ہول ناک رفتار سے حرکت کرتی زمین پر ہلکی سی توجہ بھی نہ دے پائیں گے۔

بہرحال مجھے زندہ ہونے کا احساس اپنے نئے اسکول میں ہوا جہاں مجھے زندگی کی پہلی دوست ملی۔ زونی سارو۔

اس دن اسکول میں رنگوں کا میلہ سجا تھا۔ کارنیوال کی طرز کا بڑا میلہ۔ ہر کوئی سولہویں صدی کا لباس پہنے۔ ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکریاں تھامے، خوش باش و بے فکر نظر آتا۔ ممی نے مجھے ہلکے گلابی رنگ کی بے تحاشا پھولی فراک دلائی۔ مجھے میرا گلابی بیگ یاد آیا۔ زندگی میں کچھ چیزیں جتنی غیر ضروری ہوں، اتنی اہم ہوتی ہیں۔

میں ہالیڈے گرامر اسکول کے سبز سنگی فرش کو اپنی فراک سے پوچھتی یہاں سے وہاں پھرلی۔

ستونوں کے پیچھے...... آبشار کے پاس...... اسٹریٹ ڈانس کرتے ایک گروپ کے گرد۔

مجھے اپنی ایڑیوں میں اٹھتے درد کی پروا نہ رہی۔ صرف خوشی تھی اس بات کی کہ اب میری بھی زندگی کی ویڈیوز اسکول کے ہر بچے کے ٹیبلٹ میں نہ ہوں گی۔ کوئی میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے مسل مسل کر سرخ کرتے ہوئے یہ نہ پوچھے گا کہ بولو سب کے سامنے کہ ہم دوست ہیں۔

''ہونہہ ڈینی...... تم جہنم کے آخری کونے میں پڑے رہ گئے۔ اب دیکھو میری جنت کتنی خوب صورت ہے۔''

مجھے واقعی لگا کہ اس دن اگر میں اڑنا چاہتی تو اڑ بھی سکتی تھی۔ اس دن یقیناً ساؤتھ افریقا کے پہاڑ میری تسخیر کے منتظر ہوں گے۔

تھک گئی تو اوروں کو دیکھنے لگی۔ بھول گئی تھی کہ اکیلی نہیں ہوں۔ سب کے لباس شاہکار تھے مگر...... سامنے کھڑی سیاہ فام لڑکی کے کندھے کا بروچ۔ بہت نفیس، قیمتی سا بروچ۔

''بروچ...... تمہیں کسی فارمل ڈنر پر تھوڑی جانا ہے۔''

ممی کی آواز میرے سامنے تن کر آن کھڑی ہوئی۔ انکار کی چبھن کا فگار بڑا مہلک ہے۔ میرے قدم آواز کو چیرتے اس لڑکی کی طرف بڑھے۔

''ممی مجھے بروچ پسند ہیں۔ سمجھتی کیوں نہیں۔''

لڑکیوں کا گروپ جوش و خروش سے نظم گنگنا رہا تھا۔

میرے ہاتھ لڑکی کے کندھے پر لگے۔ انگلیوں کے ناخن بروچ کے پیندے سے مس ہوئے اور میں جھٹکے سے مڑی۔ نہیں مجھے موڑا گیا۔ گھبراہٹ سے میں یقیناً اس لڑکی کے لباس سی زرد ہوئی جو میرے سامنے مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔ سیاہی مائل رنگت، بالکل چھوٹے، دو انچ جتنے بال...... سر کی جلد تک نظر آتی ہوئی۔ بے تحاشا سوجے ہونٹوں پر سجا شاکنگ پنک گلوس، میں مسکرا بھی نہ سکی۔

''ہائے دوست۔ میں زوئی [illegible] ہی آج سے۔'' میں نے اس کے [illegible] انگلیوں کو ہلکے سے مس کیا۔

''کیا تم میرے ساتھ [illegible]''

میری مسکراہٹ پر اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ [illegible] سب سے بڑے [illegible] کی طرف بڑھ گئی۔

زوئی نے مجھے اسکول کے دو [illegible] جو میں سارا سیشن نہ دیکھ پائی۔ اپنے [illegible] ملوایا جو مجھے ڈینی کے دوستوں سے [illegible] لگے۔ اب وہ اسٹریٹ ڈانس گروپ کے ایک [illegible] کے ساتھ قدیم کا میبو ڈانس کر رہی تھی۔ [illegible] میں پہلی بار پچھلی داڑھوں کو روشنی دکھائی تھی [illegible] پر اٹھ اٹھ کے تالیاں بجائیں۔ اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہوگی؟ جب ہم گھروں کو جانے کے لیے نکلے تو زوئی نے میرا ہاتھ پکڑا۔ مڑنے پر بولی۔

''تم بہت خوب صورت ہو کیلیہ زیک۔ اتنی خوب صورت کہ لوگ تمہارے حسن پر سینکڑوں ایسے بروچ وارنے کو تیار ہیں۔ جسے تم چوری کرنے والی تھیں۔''

میں نے بے ہنگم سا دھک دھک کرتے دل سے، اس کے سگریٹ کے دھوئیں میں خود کو ختم ہوتے پایا۔ اس کا چہرہ دھوئیں سے اٹ گیا۔ شاید میرا بھی...... پھر اس دھوئیں نے میرا چہرہ بدل دیا۔

☆☆☆

وہ فرانس چلا آیا تھا۔ دادا کے پاس۔ دادا ایک وادی کی گود میں فخر سے سجے گاؤں میں رہتے تھے۔ گھر قدیم فرانسیسی گھروں سا مثلث نما تھا۔ پہاڑی ٹیلے سے دیکھنے پر، اپنی اخروٹی لکڑی کے ڈھانچے کی بنا پر آئس کریم کون سا دکھتا۔ مخروطی چھت سے ڈھائی فٹ اونچی چمنی سے دھواں ہمہ وقت نکلتا۔

گھر کے سامنے، ربڑ کا سایہ گد نما درخت تھا۔ آگے دادا کا انگوروں کا باغ، کنکریٹ کے مضبوط ستون اور کاپر کی تاروں پر لپٹی، کئی میل تک جھاگ سی پھیلی بیلیں۔

بیل دینے پر انتظار کرنا پڑا۔ دروازہ کھلا۔ پھر دادا گہرے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس، ہاتھ میں پینٹ برش اور چہرے پر کئی دھبے لیے کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی خود سے لپٹالیا۔ رئیس نے گہری سانس لی اور اسے لگا۔ یہ سانس جانے کب سے اندر دہائیاں دیتی تھی اور اسے یہی گود چاہیے تھی اپنے اخراج کے لیے۔ ایسی سانسیں ہر کسی کے اندر ہوتی ہیں۔ کوئی ہمدرد تلاشتی۔

دادا اکیلے رہتے تھے۔ باغ کی رکھوالی کے لیے دو ملازم تھے۔ دادا کسی ترسی ماں کی طرح اس کے گرد چکر کاٹتے۔ اس کا چہرہ ٹٹولتے۔ زبردستی نوالے بنا بنا کے کھلاتے۔

"تھکن کا پہاڑ۔" ہولے ہولے کم ہونے لگا تھا۔ رئیس بہت خوش تھا۔ وہ بات کم کرتا۔ دادا کو اچھا سامع میسر آ گیا۔ وہ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے فلسفہ نگار اور اس کی تصنیف پر بول سکتے تھے اور بولتے بھی۔ اچھا کھانا پسند کرتے تھے۔ ان کی رسوئی کا ایندھن کبھی دھیما نہ پڑتا۔ رئیس کی وراثت تھا یہ شوق۔ وہ کافی کی مقدار جسم میں خون سے بھی زیادہ دیکھنا چاہتے۔ قدرت سے مقابلہ کرتے ہوئے کافی پیتے۔ ہاں مگر رئیس کو کچھ کھٹکتا۔ تیسرے دن دادا سے بولا۔

"دادا! جائے نماز کہاں ہے؟"

دادا نے چھلنی سے میکرونی چھانتے ہوئے گھوم کے اسے دیکھا۔

"تم نے میکاڈلے کا ریاستی نقشہ پڑھا؟ ایک شہزادے کو کیسا ہونا چاہیے؟ آؤ، میں تمہیں وہ کتاب دیتا ہوں۔ تم وہ پڑھو۔ تمہیں پتا ہے میرے پاس میکاڈلے کی سرکاری "مہر" کی ایک نقل بھی ہے۔ جن دنوں میں نے کیمبرج میں لیکچرز دیئے تھے تب حکومت برطانیہ نے مجھے اعزازیہ کے طور پر وہ مہر بھجوائی تھی۔"

رئیس خاموش رہا۔ بعد میں سارا گھر چھان مارا کوئی جائے نماز، قرآن کا نسخہ یا تسبیح نظر نہ آئی تو وہ حیران رہ گیا۔

☆☆☆

امریکہ کے امرا کی نگری۔ فیشن میں رنگ عروج سے جا ملے۔ سفید وردیوں والے ملازم روبوٹک انداز میں چلتے، آواز سرگوشی سے بلند نہ کرتے۔ جنت کا اکلوتا مالک نچلی منزل کے دائیں طرف والے آخری کمرے میں تھا۔ ڈیجیٹل لائبریری کی طرز پر بنا اسٹڈی روم۔ شاہانہ امارت۔ آرم دہ کرسی، سامنے میز پر دھری قانون کی کتابیں اور کھلا ہوا قلم۔

وہ تنہا وجود کونے میں مساج چیئر پر چت پڑا تھا۔ بند آنکھوں سے اندر اترتی شعاعوں کو محسوس کرتا اور کن پٹی کی پھڑکتی رگ کو بھی۔

اسے یاد آیا تھا کہ وہ اپنی بات کو معقول کہتا رہا اور وہ نامعقول۔ حالانکہ وہ منطق کی چھوٹ دینے کو تیار تھی اسے۔ اب سامنے اسکرین پر بولتا شخص اس سنہری سیدھے بالوں والی اینکر کو منطق اور معقولیت کا فرق بتا رہا تھا۔ کیسے کوئی سوچ منطقی ہو سکتی ہے اور معقول نہیں اور کیسے معقول پر..... غیر منطقی۔ ساری تباہیاں اسی فرق نے ہی تو پھیلائی تھیں۔

اس نے ریموٹ کا بٹن دبایا تو مساج چیئر آگے پیچھے جھولنے لگی۔ وہ مزید خود میں سمٹا۔ نیویارک کی شام، رات کی آغوش میں گرنے لگی۔

☆☆☆

"میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ سول سروسز کا امتحان پاس کر جاؤں۔ قائد اعظم لائبریری کے اخروٹی خانوں کی گرد تک میرے پوروں نے صاف کر ڈالی ہے۔ کتابوں کا ڈھیر مگر..... پڑھنے کے لیے وقت نہیں۔"

وہ رک کے ضبط کھوجتا رہا۔ وہ اپنی لین کے اختتام پر بنے پارک میں سنگی بنچ پر بیٹھا تھا۔ ماہا اور رئیس خان زادہ کے درمیان کوکیز کا جار پڑا تھا۔ پاؤں جھلاتی لڑکی بسکٹ کتر رہی تھی۔ نومبر کی دھواں نما دھند ڈھل کر شام ہونا چاہ رہی تھی۔ نومبر کی دھواں نما دھند ڈر ڈر کر دھرتی پر اترتی، تکلف دکھائی۔ وہ نیم دراز سا

خلا پر سر ڈھلکائے سنبل پر بیٹھے بیگ دیکھتا۔

"تمہیں معلوم ہے ماہا! میں کتنا تھک جاتا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے......"

"مغیث! ٹھہرو...... گر جاؤ گے۔" ماہا تیز اکتائی آواز میں چھ سالہ ماموں زاد کو ٹوکتی۔ گاؤں سے شہر ننھیال میں تعلیم کے لیے آئی تھی وہ۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟" بے دلی سے مڑی۔ رئیس نے ہونٹ دبائے۔

"کچھ نہیں...... تم پریشان ہو؟"

"کل رات میرا فون باتھ روم ٹب میں گر گیا۔ اوپر سے مامی کی صلواتیں۔ میرا سر پھٹ رہا ہے۔" وہ سیدھا ہوا۔

"تم نے بتایا نہیں پہلے۔"

"کیا بتاتی؟" وہ بے زار ہوئی۔

"اچھا، فکر مت کرو۔ کچھ کرتے ہیں۔"

"کیا کرلو گے؟ رہنے دو۔ تمہاری بھی تو ایک عدد مامی ہیں۔ ویسے بھی آج کل میں آئی فون ایٹ کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔"

وہ ناراض، انسان تھی...... ہر ایک سے اکتائی۔ کڑواہٹ کو منہ پر سجائے پھرتی۔ ہر کسی کو حصہ دار بھی بناتی۔

"میں کبیر سے بات کروں گا، وہ کرلے گا۔" رئیس اکلوتے دوست کو بطور تسلی استعمال کرنے لگا۔ وہ جرمنی میں اچھا خاصا سیٹل تھا۔

"ٹھیک...... مان لیا۔ مغیث! چلو شام ہوگئی ہے۔" وہ لٹھ مارتی اٹھی۔

"تمہاری کوکیز اچھی لگیں۔ بادام فلیور اوکے لگا۔" چار مغیث کی بغل میں پھنسا کے وہ اسے ہانکتی لے گئی۔ نجانے کتنی دیر وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں دبائے، اندھیروں میں تیرتا رہا۔ سیدھا ہوا تو دوسرے کونے پر بیٹھے تیرہ سالہ وجود کو دیکھ کے گہرا سانس لیتا رہ گیا۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ میں اب ناکام ہونے لگا ہوں۔ بہت تھکنے لگا ہوں۔" سنبل کا اک پتا ٹوٹا، اس کی گود میں گرا۔ وہ ...... کی ...... سہلانے لگا۔

"...... بات ...... کی اہمیت پیاسا ہی جانتا ہے ...... کی لذت کا اندازہ صرف ...... زندگی کی کوکھ میں ...... لوگوں کے لیے ہی ...... ہیں۔"

"آہ...... شاید ایسا ہی ہو ...... ہوا میں افسردہ ہوکر اس کے ...... درختوں نے زور زور سے جھول کر اس ...... خلاف احتجاج کیا۔ تب ہی ایک آواز ...... سمت آئی۔

"رئیس...... رئیس یار! ایک کام تھا تم سے۔" اذہان دھپ سے اس کے قریب بیٹھا۔

"اس لڑکی سے میرا تعارف کروادو۔ میں صرف اس کی آواز سننا چاہتا ہوں۔" رئیس چونک کے مڑا۔ ذرا فاصلے پر وہ حنوط شدہ لاش سی لڑکی ٹانگ پر ٹانگ جمائے، گردن ڈھلکائے، ایک ہی نقطے پر نظریں جمائے جانے کب سے بیٹھی تھی۔

"اذہان یار! میری تو خود ابھی رسمی سی ملاقات ہوئی ہے، میں بھلا کیا کرسکتا ہوں۔"

"شاہ میر نے خود تمہیں اس سے گپ شپ کرتے......" الفاظ کی ترتیب کہیں منہ میں ہی دب گئی کہ وہ دونوں کے سر پر کھڑی تھی۔

"کیا تمہارے پاس اسکیٹ شوز ہیں چھوٹے لڑکے۔ اور ہاں...... ہائے...... تم دونوں کو۔ میں ام ہالہ ہیں......؟ اسکیٹ شوز؟"

اذہان پر جیسے شادیٔ مرگ طاری ہوا۔ رئیس نے کو بغور دیکھا۔

"میرے پاپا برانڈڈ لائے تھے ناروے سے۔ ویسے اس کے علاوہ بھی ہیں۔" وہ قدموں میں لڑکھڑاہٹ لیے "ہالہ" کے ساتھ جارہا تھا۔

اذہان ایسا ہی تھا۔ جب تیرہ سال کا تھا تو ون ڈائریکشن کا لائیو کنسرٹ دیکھنے کے بعد گی

دن تک وہ اندھوں کی طرح دیواروں، ستونوں اور سیڑھیوں سے بھڑتا رہا تھا۔ آسٹریلیا میں اپنے ماموں کے توسط سے رونالڈو کا آٹوگراف والا فٹ بال اسے پانچ دن تک بخار میں جھلساتا رہا تھا۔

ابھی کچھ دن پہلے تک وہ ایونجرز کی سپر لیڈی ''اسکارلٹ جوہانسن'' کا ٹیٹو کھدوانے کے درپے تھا۔ شاید یہ عمر ہی ایسی تھی۔ درختوں کے پتے ابھی بھی فلمی سانزدل دکھا رہے تھے۔

رئیس سر جھکا کے مسکرانے لگا۔ اسے یاد آیا کبیر کو فون کرنا تھا۔ وہ مسڈ بیل دینے لگا۔

''رئیس خانزادہ! جو بات میں منہ سے نکالنا نہیں چاہتا، وہ خود سمجھ جاؤ تو بہتر ہے۔''

اس نے ساتھ بیٹھے وجود کو ان سنا کرتے ہوئے دوست کو رات فون کرنے کا پیغام لکھا۔ پھر گھاس پر لڑھکتے کھاتے پتوں میں منظر ابھرنا شروع ہوئے۔ ایک منظر باقی کو مات دیتا واضح ہوا۔ وہ ربڑ کے درخت کے چوڑے، چھدرے پتوں والا منظر..... منظر میں داخل ہوں تو پتوں کے نیچے کا منظر کچھ یوں تھا۔ ربڑ کی جھولتی شاخوں کو نیچے سے ترتیب وار کاٹا گیا تھا۔ نیچے میز پر چیس کی بازی سجی تھی۔

دو کرسیوں پر وہ دادا پوتا بیٹھے تھے۔ فارم کے رکھوالے جان کی بیوی لارا کوئی خوب صورت فرانسیسی نظم گنگناتی اپنے گوشت بھرے وجود کو بخوشی گھر کے اندر باہر اٹھائے گھومتی اور میز کھانوں سے بھرے رکھتی۔

''تمہارا باپ اور اس کا باپ کبھی صبر والے نہ رہے۔ میں تو حد درجہ حریص رہا ہوں۔ گرمیوں میں اماں آم اور سیب کا مربہ بنایا کرتیں تو گرم شیرے میں انگلی ڈبو ڈبو کر چاٹتا رہتا۔ یہاں تک کہ انگلی پر پڑا آبلہ مزید عیاشی سے روک دیتا۔'' وہ بے توقیر کر دینے والی ہنسی ہنسے۔

''یوں ایک دفعہ دادی جان نے مجھے تحفہ دیا۔ مٹی کا گلک۔ شاید صبر سینچنا چاہتی تھیں مجھ میں۔ مگر اس تھراپی کا الٹ اثر ہوا مجھ پر۔ میں مزید بے صبرا اور حریص ہو گیا۔ ہر اس ذریعہ کو لالچی نظروں سے دیکھنے لگا جس سے رقم ملنے کا کم سے کم بھی امکان ہو۔ اپنی یونیورسٹی کے دور میں بھی شاید سب سے کم ظرف میں ہی رہا۔ پڑھانے نکلا تو سب کچھ ابھی کی چاہ میں ایک یونیورسٹی چھوڑ۔ دوسری پکڑتا۔

پھر تمہارے باپ کی باری آئی۔ وہ مجھ سے دو ہاتھ آگے نکلا۔ وہ عورت اور دولت دونوں کے معاملوں میں بے صبرا تھا۔ پہلی بستر مرگ پر تھی، وہ دوسری لے آیا۔

رئیس کو چیس میں سے اپنی ماں کی ابکائیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ان ابکائیوں کے ساتھ چوڑیوں، زیورات کی چھن چھن..... اپنا رونا..... دادا کا چلانا..... پاپا کا تغافل۔ یوں اس کی ماں مر گئی۔

''خیر، اسے کون سا دکھ تھا۔ اس بدبخت نے اسے چھوڑا..... میری زمینیں بیچیں، چلا گیا ٹورنٹو۔ تب مجھے اپنی نسل، اپنے خون کے بے وقعت جوش کا اندازہ ہو پایا۔ پھر اگلی نسل آئی اور صبر بھی آ گیا۔'' وہ مسکرائے۔ ''میرے بچے تم میری نسل کا بہترین جین میوٹیشن (جنیاتی تبدیلی) ہو۔ میں پچھلے کئی سالوں سے ارتقاء کے اس ماڈل پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ انسانی نسل خودکار طریقہ سے تین نسلوں کے بعد ایک ''جدید'' انسان متعارف کروائی ہے۔ جو پچھلوں سے بہتر ہوتا ہے۔''

اب وہ رئیس خان زادہ کی آنکھوں میں جھانکنے لگے تھے۔

''جو بہتر ہوتے ہیں اپنی خصوصیات میں، جو پچھلوں کی طرح حالات سے ''فرار'' نہیں ہوتے۔ ماضی کے غار کو پتھر رکھ کر عدم کرتے ہیں۔ حال کے سینے پر تلوار گاڑھ کے فاتح بنتے ہیں اور مستقبل کی تکمیل ہاتھوں سے ڈھیلی نہیں ہونے دیتے۔''

''میں اتنا بھی صبر والا نہیں دادا! واپسی کا راستہ ایسے قزاقوں سے عبارت ہے جو میری عزت نفس، میرے خواب لوٹ لیں گے۔''

خیر..... رئیس خان زادہ یہ الفاظ دادا سے کبھی

کہہ ہی نہیں پایا کہ وہ صبر کے ساتھ غیرت بھی رکھتا ہے۔ بولا تھا۔

"دادا! اگر بیٹا باپ ہی ہوتا تو انسان کی صدیاں آج بھی لمحوں جیسی ہوتیں۔ غاروں میں رتیں اور کچے گوشت کے لیے جنگوں پر منتج ہو جاتیں۔ میرے اللہ کو وقت کی رفتار متعین کرنے کے لیے متفرق دماغ بنانے پڑے۔"

دادا کی تیوری پر پڑے وہ غصیلے نقش، رئیس نے پڑھ لیے۔

"دادا..... مجھے..... مجھے لگتا ہے جیسے..... جیسے اللہ اور آپ....."

"تم ابھی چھوٹے ہو۔ بہت چھوٹے....." دادا نے بات ہی ختم کر ڈالی اور بالآخر اس پر عیاں ہو گیا کہ نانا اسے ملحد نسل کیوں کہتے ہیں۔ ربڑ کے پتوں سے خاموشی ریت کے جیسے سرکنے لگی۔

وہ اسی بنچ پر واپس مڑ آیا۔ شام ڈھل کر رات میں بدلنے کو تھی۔ پارک کے لیمپ پوسٹ گواہی کو تھے۔ وہ گھر کو چل دیا۔ اذہان اور ہالہ اسکیٹ بورڈ میں مشغول تھے۔ ہالہ ہوا میں اچھلتی، زاویہ بدلتی اور گر جاتی۔ مگر مگن رہتی۔ وہ گھر کے داخلی دروازے پر کھڑا مسز کرنل کو سرخ چہرے کے ساتھ ہالہ کی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

نیو یارک میں سورج آج بھی زندگی پھونکنے میں ناکام رہا مگر رات ہمیشہ سی روشن ترین، آسمان سے دیکھو تو زمین کسی پری زادی کی سیاہ پوشاک دکھتی جو زرد اور نارنجی چمکیلے پھولوں سے آویزاں ہو۔ سڑکوں پر دیکھو تو گرم لبادوں میں ملفوف لوگ۔ یوں خوش مصروف اور پرجوش دکھتے کہ جیسے مسکرانے اور سڑکوں پر چہل قدمی کرنے کو ہی پیدا کیے گئے ہوں۔

دنیا کے چند بڑے خبر نامے کے اداروں میں سے ایک وہ تھا جس سے وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکلے۔ یہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ انڈر گراؤنڈ پارکنگ کے سامنے کا حصہ..... دونوں سیاہ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔

لڑکی نے اپنے سنہری بھورے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ آنکھیں سکوڑیں اور لیمپ پوسٹ کی روشنی میں سرخ ہوتی ناک کے ساتھ اسے گھورتے لڑکے کو دیکھا۔ کیا کوئی "آہ" میں چھپی کہانی جان سکتا ہے۔ کوئی اس لڑکی کو دیکھتا تو جان لیتا۔ یہ لڑکی کہ جس کا دل پچھلے تین گھنٹوں سے حالتِ مرگ میں تھا۔ کبھی تیز رفتار سانسیں بھرتا تو کبھی یوں ادھ جاتا کہ وہ خود کو بے ساختہ ٹٹولنے لگتی۔ "زندہ تو ہوں"۔

"بہت خوب دوست۔" بالآخر "آہ" نے شروعات کی۔ داستان نے چونک کر دیکھا۔ مسکرا نہ سکا۔ وہ مزید بولی۔

"آج سے بہت سالوں پہلے جب زندگی اپنے وجود کے بارے میں بہت فکرمند تھی۔ تب میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں تم سے یہ کہوں گی۔ جتنا میں نے جانا تم اتنے بھی بے کار نہ تھے۔" دونوں کے لب یکجہتی سے مسکرائے۔

"یہی سب میری طرف سے بھی اپنی یادداشت میں محفوظ کر لو۔" آنکھ سے ادارے کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"گویا آج بھی لفظوں کے معاملے میں کنجوس ہو۔"

"نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں۔ مگر حیرانی الفاظ کی ادائیگی میں تاخیر کا سبب ضرور ہے۔" دونوں خاموش رہے۔

"اور کیسا چل رہا ہے سب؟" اب کی بار لڑکے نے قفل کو چابی دکھائی۔

"پرسکون..... شاید یہ لفظ بہترین ہے۔ تم بتاؤ؟ کوئی ریسٹورنٹ نیو یارک میں کھولنے کا ارادہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو میرے بچے خوشی سے پاگل ہونے والے ہیں۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔ مقابل وہ بھی نہ کر سکا۔

"اوہ....." گردن کی لہر کو تندہی سے دبا کے

بولا۔
"تو بالآخر۔ خاندان بنالیا تم نے۔" سردی سے سُن ہوتے ہاتھوں کو جھٹکا اور ناختوں کو بغور پڑھا۔ یہ سب انتہائی ضروری کام نہ کرتا تو لڑکی کا چہرہ ہار مان لیتا۔ اپنی آہ کھول دیتا۔
"میرے بچوں..... بچوں سے ملنے ضرور آنا۔ ہم انتظار کریں گے۔ ایک کال کر لینا۔" وہ اپنا کارڈ تھما کے بولی۔
"ضرورت نہیں۔ ہم پہلی فلائٹ سے واپس جارہے ہیں۔" کارڈ اپنے اسسٹنٹ کو پکڑاتے وہ چٹانوں سے لہجے میں بولا۔
پھر اس کی ہیل کی ٹک ٹک میں تیزی در آئی تھی۔

☆☆☆

رونی سارو کی دکھائی دنیا لطیف تھی۔ ابتدائی اندرونی مخالف لہروں کے بعد سب پرسکون ہوگیا۔ پہلے بے حس تھی پھر بے نیاز بھی ہوگئی۔ لباس بدلا۔ چہرے کو رعونت سے بھرا کچھ رنگ بھی بھرا اور لہجے بن گئی اک نئی کیلازیک۔
ممی مطمئن ہوئیں اور اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں نئے آئے مارکیٹنگ منیجر سے شادی بھی رچالی۔ پتا چلا کہ ڈیڈ تو نئی ممی کے ساتھ ہنی مون منانے مصر بھی چلے گئے۔
وقت کی رتھ بے لگام ہوگئی اور رتھ پر سوال سال تاریخ کی سڑک پر گرتے چلے گئے۔ میں زندگی کے بیسویں سال لگی ہی تھی کہ گھر میں پھر سے پتھروں کی بارشیں آن ٹھہریں۔ ممی اور اسٹیورٹ کی جھڑپیں۔ اسٹیورٹ اچھا تھا۔ کم از کم تب تک جب تک کہ میں جوان نہ ہوگئی۔ اس کے بعد وہ مزید اچھا ہونے لگا۔ اتنا کہ زہر لگنے لگا۔ غلیظ..... ہائی اسکول ختم ہوا اور یونیورسٹی شروع ہوئے بھی دوسرا سال تھا۔ اب لگتا اسٹیورٹ بدمست گینڈے سا، بس رسیاں تڑا ہی ڈالے گا۔
یہ بات مجھے خائف کرتی۔ ڈیڈ سے رابطے کی کوشش زور پکڑ گئی مگر وہ رہے ازل سے مسافر۔ ممی کی مجھ سے ماڈلنگ کرانے کی مانگ اور اسٹیورٹ کا میری تلاش میں رہنا یا شاید کسی اچھے وقت کی۔ جانے کیوں پر مجھے لگتا ڈیڈ ہی میرا واحد حل ہیں۔
اس رات اگست کی پہلی بارش ہوئی۔ ہلکی اور کم خطرناک۔ ممی شہر سے باہر تھیں اور اسٹیورٹ گھر کے اندر۔ میرا سکون جیسے کسی بے نام جزیرے پر رخصت ہوگیا۔ میں پھر ڈیڈ کا فون نمبر ملانے لگی شاید اس بار..... فون کا بل نہ بھرنے کی وجہ سے میں مزید کالز نہ کرنے کی مجاز ٹھہرائی گئی۔ میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ جیکٹ کی جیب میں رکھا اور کچھ ضروری کام نمٹانے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

جب وہ کتابیں لیے قائداعظم لائبریری سے نکلا تو شام کی سیاہی میں اضافہ ہونا شروع ہو چکا تھا۔ سمیعہ آنٹی کے بھائی کے گھر پر دعوت تھی۔ سب وہیں تھے۔ رئیس فراغت پا کے کرمنالوجی کی کتابیں لینے آ گیا۔ وہ کتابیں سینے سے لگائے۔ فون پر وقت دیکھنے کو جھکا کہ قیامت ٹوٹ پڑنے والی آواز کے ساتھ گاڑی کے چرچراتے ٹائر اس کے قریب رکے۔ وہ بدکا، فون نیچے گر گیا۔
"کیا گھر چلو گے؟" ہالہ نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔
"وہ میں....." وہ فون اٹھانے جھکا۔ اٹھا تو ٹریفک پولیس موبائلز سائرن بجاتی، گاڑی کی طرف آتی دیکھیں۔ اس نے شاید قانون توڑا تھا۔
ہالہ نے گالی دی اور ریورس گاڑی بھگانے لگی۔ سڑک پہ خاصا تماشا لگ گیا۔ تیز آواز میں بجتا انگریزی گانا، ہالہ کی ہاؤ ہو۔ لوگوں کا تجسس، رئیس کا چیخنا۔ وہ دوسری تنگ سمت کو جو جم خانہ لاہور کو مڑتی تھی، کو مڑ گئی تو رئیس تیز قدموں سے ادھر کو چلا۔ پھولی سانسوں کے ساتھ اس نے ہالہ کی گاڑی کو تقریباً دوسری دو گاڑیوں پر چڑھا ہوا پایا۔ خود وہ باہر نکل آئی تھی۔ لوگوں کا جمگھٹا بڑھ گیا۔ بالوں کا اونچا جوڑا، کئی

پھٹی جینز، سیاہ کھلی شرٹ کا گلا ڈھلکنے سے سپید کندھا برہنہ تھا۔ رئیس پھر دل گرفتہ ہوا۔ وہ ضدی بچی معمولی چاکلیٹ کے حصول کے لیے قیمتی ترین کھلونا توڑنے والی تھی۔

رئیس نے چاہا کہ اسے لوگوں کی موبائل اسکرینز سے دور کردے۔ مگر وہ سر جھٹک کر کرنل صاحب کو فون ملانے لگا۔

☆☆☆

رات کسی بھٹکے عامل کے جادو سی سیاہ تھی۔ رات کے کسی پہر برفانی طوفان کا بھی امکان تھا۔ ایسے میں ہر کوئی، خود کو گھر میں مقفل کر کے سونے کی تیاری کر رہا ہوگا اور میں سپر مارٹ تک آئی تھی۔ مارٹ بند ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا مفلر کسا۔ لاوارث بوتل کے ڈھکن کا نشانہ لیا اور آگے بڑھی۔ گھر جانے سے بہتر بیس منٹ کی مسافت پر موجود دوسری مارٹ تک جانا تھا۔ گھر ہر کسی کے لیے عافیت کدہ نہیں ہوتا۔ میرے لیے بھی نہیں تھا۔

سوچیں میرے ساتھ سفر کرتی۔ مرکزی مارکیٹ تک گئیں پھر وہاں سے رخصت ہو گئیں۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ موبائل کا بل بھرنے اور کچھ چاکلیٹ خریدنے کے بعد میں باہر نکلی تو بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ میرے قدموں میں تیزی آئی۔ مرکزی سڑک سے ذیلی سڑک مڑتے مجھے میرے کانوں نے پیچھا کرتے قدموں کا خطرہ، دماغ تک پہنچا دیا اور مجھے رک جانے کا حکم ملا۔ جسم نے جھٹکا کھا کر عمل کیا۔

قدموں کی آہٹیں بے خوف سی آگے بڑھیں۔ اب صورت یہ تھی کہ سامنے کی سڑک خالی تھی۔ دکانوں کے شیشوں پر کلوزڈ کے بورڈ نظر آ رہے تھے۔ کچھ دور یعنی چند فرلانگ دور ایک بڑی سی گاڑی کھڑی تھی۔ اور ملگجا اندھیرا، سیاہ جھلی سا تنا، مزید کچھ دکھانے سے انکاری۔ وہ پیادہ فوج سا جتھا، خود کار طریقے سے میرے گرد گھیرا ڈال کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے آنکھیں میچیں، گہری سانس لی اور ہپی لڑکے کندھے سے پار چند فرلانگ دور کھڑی گاڑی کو پھر سے دیکھا اور ایک ہیولا [illegible] تاریکی میں اس کا ایک کندھا [illegible] فونز اور چہرہ ڈھکا ہوا [illegible] میوزک سنتا وہ ہیولا فون پر انگلیاں چلا رہا [illegible] مدد کا کوئی موقع نہیں ملنے والا تھا۔ تاریکی میں [illegible] رینگنے لگا۔

ہپی لڑکوں کے ٹھیک ٹھاک کے [illegible] گنگنانے تک اپنا کراس بیگ ہتھیار کی طرح سنبھال لیا میں نے۔ فون جینز میں اٹکایا اور بیگ [illegible] کے منہ پر دے مارا۔ وہ شہتوت کی ٹہنی سا [illegible] نے بھاگنا چاہا مگر ایک کے ہاتھ مفلر کا کونا آ گیا [illegible] نے کھینچنے میں جان لگا دی۔

میں اسپرنگ کی طرح دوبارہ اسی پوزیشن پر [illegible] گئی۔ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

”میری مدد کرو۔“ میں حلق کے بل چلائی۔ ہیولے کی ٹانگ ویسے ہی تھراتی رہی۔ میری چیخ چھٹنے کو تھی۔ میں اندھا دھند جاگرز چلا رہی تھی۔ اب حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ پانچوں شہ زور تھے میں اکیلی اور دور کھڑا شخص غافل۔ میں چھوٹی موٹی چور تھی۔ کوئی رسل میپا کی گولڈ بیلٹ نہیں۔

عزت داؤ پر لگی تھی جس کی حفاظت کا عہد میں نے خود سے کر رکھا تھا۔ میں اس عہد میں ہمیشہ ایمان دار رہی۔ بالآخر میں نے آخری داؤ کھیلا۔

میرا ایک پاؤں نیگرو ہپی نے دبوچ رکھا تھا اور جینز کو تار تار کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا پاؤں میں نے ہوا میں بلند کر کے اس کے منہ پر مارا۔ نتیجتاً ہم دونوں منہ کے بل گرے۔

میں نے کراس بیگ اٹھایا اور پوری قوت سے اس دور کھڑے شخص کو دے مارا۔ لڑکے پھر سے کھینچا تانی کرنے لگے۔ میرے ناخن ان کے چہرے رنگین کرنے لگے تو میں نے دیکھا میرا بیگ اس کے قدموں سے چند قدم دور گرا مگر وہ چونکا۔ ہیڈ فونز اتار کے ادھر دیکھنے لگا۔

”میری مدد کرو پلیز۔“ وہ سیدھا ہوا۔ غیر معمولی

مضبوط جسم والا آدمی۔ اس کے ہونق پن پر میرے اعصاب کھنچے۔

"او قفلی ماچومین کی اولاد۔ تم سے کہہ رہی ہوں۔ مدد کرو۔" وہ بے ساختہ دو قدم آگے آیا۔ لڑکے غرائے۔ وہ واپس دو قدم ہو گیا۔ دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا دیئے۔

"یہ تو بڑا چکر ہے باس۔"

"تو پھر دفع ہو جاؤ جہنم میں، یعنی شخص۔" دل چاہا انہیں چھوڑوں اور دو چار جھانپڑ اس سانڈ کو لگا کے آؤں۔ مگر یہ چھوڑتے تو......"

میں نے لڑکے کے کندھے پر اس زور سے دانت گاڑے کہ اس کی چیخوں نے آس پاس کی دیواروں میں جیسے دراڑیں ڈال دیں۔ بالآخر جیکٹ کٹ پھٹ کے اتر ہی گیا۔ اب وہ شرٹ پہ جت گئے۔ میرے حوصلے ختم ہو گئے۔

"خدارا...... مجھے چھوڑ دو۔" التجا نکلی۔ وہ نظم گنگنانے لگے۔ چر رکی آواز سے ایک لڑکے کی جلد کٹی اور خون کی ندی بہنے لگی۔ ہیولا ایک جیبی چاقو لیے آگے آیا۔

"سب چلتے بنو گے یا پھر سب کو ہی یادگاری نشانیاں دینی پڑیں گی۔"

میں دنگ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ بھلا شیطان بھی مدد کرتے ہیں۔ میرے گرد بھاگتے قدموں کی آوازیں گونجیں تو میں چونکی۔ وہ پیتل سی آنکھوں سے مسکراتا مجھے دیکھتا اور پہچانتا۔ میں نے مفلر ڈھونڈا، لپیٹا۔ بیگ پہنا اور شکریہ کہہ کر چل دی۔

"اوئے تم نے پہچانا نہیں دوست۔" وہی شیطانی آواز۔

"میرا ارادہ تو تمہیں اپنا رین کوٹ دینے کا تھا۔ ویسے کافی بھی ہے میرے پاس اور تمہیں گھر تک چھوڑ بھی سکتا ہوں میں۔"

"اوہ...... واقعی؟ جیسے میں جانتی نہ ہوں کہ کافی کے لیے ایک پینی بھی نہیں تمہارے پاس۔ یہ جس گاڑی سے ٹیک لگائے امارت جھاڑ رہے ہو اس کا مالک کبھی بھی آ سکتا ہے۔ اور رہا رین کوٹ...... وہ تمہیں خود چاہیے ہوگا آخر اتنی دور چل کے جو جانا ہے۔"

جوابی جملوں نے مقابل پر واضح کر دیا کہ اس بار مقابلہ برابری کا ہوگا۔ وہ حقیقتاً حیران تھا۔

"واہ مزا آ گیا۔ اتنی مدت کہاں تھیں تم؟ زبان کی دھار تو خوب تیز کروالی۔ مگر یہ افریقی شترمرغوں کا گھونسلہ۔ کیا یہ واقعی لاعلاج ہے؟" الجھے بالوں کا اشارہ۔

وہ رک گئی۔ زہریلا سا مسکرائی۔

"ویسے جسم تو بڑا ہالی وڈ بارول ہیروز جیسا تراش لیا ہے۔ مگر یہ شیطانی لہریں پھیلاتی آنکھیں...... ان کا کچھ نہ بن سکا۔ نہ ہی منہ کی بدبو کا۔" مقابل کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔

"پھر ملتا ہوں تم سے کیلہ زیک۔"

"کبھی نہیں ڈیمنٹل کلارتھ۔" میری جھلاہٹ پر وہ سینے پر ہاتھ رکھتا جھکا پھر تاریکی کی چادر ہم دونوں کے درمیان تن گئی۔

☆☆☆

وہ کاغذ پر بے ربط و بے ترتیب الفاظ لکھتا جاتا تھا۔ اسٹور روم کی دیواریں بے مصرف چیزوں سے بھری پڑی تھیں اور سنگل بیڈ کتابوں سے۔ کچھ وقت پہلے کی ہل چل ڈھول کی طرح تھک بیٹھی تھی اور خاموش ویرانی میدان میں اتر آئی۔

شاہ میر اور سمیعہ آنٹی ڈنمارک گئے تھے۔ اب سکون تھا۔ سکون...... چاہے لمحے کے لیے ہزاروں جسے کے لیے ہی ملے۔ ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

"اوئے بے دینا، کدھر ہے تو۔" قلم گرا۔ جنزل پھینک کر وہ تیزی سے دروازے تک آیا۔

"جی نانا۔" کوئی فرماں روا بھی ایسی عقیدت سے سن لیتا تو سات پشتوں کو بخش کر امان دے دیتا۔ مگر وہ ہاشم کلیم تھے۔

"کاغذوں پر لفظ یوں بکھیرتا ہے جیسے فقہ کی ساری پرتیں کھول کے بیٹھا ہو۔ پر ہے تو اپنے دادے

جیسا بے دین ہی.....''

اکثر ہی..... وہ کہنے کچھ آتے اور کہہ کچھ جاتے۔

''کوئی غلطی ہوگئی تو معذرت چاہتا ہوں نانا! آپ یہاں آئیں، بیٹھیں۔''

''او چل چل۔'' ہاتھ جھلا کر خود سے دور رکھا اسے۔ ''تیرا نسب گنوانے نہیں آیا بلکہ کہنے آیا ہوں کہ تو جو یہاں فراغت کی گود میں چڑھا بیٹھا ہے۔ میرے جوڑوں کے درد کی دوا ہی بنا دے۔ یہ جو تیری کاہلی ہے ناں۔ تیرے سارے گن کھا رہی ہے۔ ذرا جو وقت ملا، تو اینٹھ کے پڑ جاتا ہے اپنے اس اڑن کھٹولے پر۔ میرٹ ہے تمہیں۔ نوکری تو لگنے سے رہی۔ باندر دی اولاد۔''

وہ چپل گھساتا، اذیت حلق کے خلا میں دباتا، لان میں نکل گیا۔ تیز دھار چاقو سے ایلوویرا کاٹتے ہوئے، اس نے شبنم کے قطروں میں بے تحاشا سبزہ دیکھا۔ جدھر نظر اٹھاؤ، بس سبزہ۔

☆☆☆

چھوٹی واسکٹ اور ڈھیلی چمڑے کی پتلونوں والے گڈریے۔ اپنے سرخ گالوں اور پیلے دانتوں کا سنگم لیے، فرانسیسی لوک گیت گنگناتے۔

وہ دادا کے ساتھ قریبی گاؤں سے لوٹ رہا تھا۔ ہاتھ میں کوکو بیج تھے۔ آسمان نیلے اور اودھے رنگ کا جھلملاتا آنچل دکھاتا جو کسی ملکوتی وجود کو چھو کر گلال ہوگیا ہو۔ کالے انگوروں کی بیلیں اور کچے سیبوں کی ترش سی مہک۔ دادا کی سانس ڈھلوان کی چڑھائی کے دوران خاصی رفتار پکڑ چکی تھی۔ وہ اسے بتاتے کہ کوکو بیج کیسے سکھائے، پیسے اور استعمال کیے جاتے ہیں وہ سر ہلاتا۔

''تم ہاشم کی طرح سر ہلانے لگے ہو۔'' وہ کچھ رک کر کے مسکرائے۔

''وہ تھا تو جماعت کا نمبر ایک بدھو۔ مگر لیکچر کے دوران سر یوں ہلاتا گویا مجھے تو معلوم ہے۔ آگے نہیں، کہہ رہا ہو۔ پاس ہوجاتا ہر بار۔ میرے پوچھنے پر کہتا، اللہ عزت رکھنے والا ہے۔'' وہ ہنسے لگے۔ وہ خجل ہوا۔

''دادا! ایسے کیوں ہنستے ہیں؟ عقائد ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''ایسے ہی مطلب اندھے۔ پھر دیکھو..... نوکری نہیں ملی اسے۔ آبائی زمینوں کی آمدنی کھاتا ہے اور پنجابی میں گالیاں بکتا ہے۔ اس کے اللہ نے عجیہ مجھے کیوں..... اسے کیوں نہیں دی؟''

''کیونکہ اللہ انہیں اس اذیت سے بچانا چاہتا تھا جسے آپ نے شادی کے تیسرے سال ہی جھیلا۔ عجیہ دادی کی موت۔'' دادا رک گئے۔ ''اللہ نے حفاظت کی ان کی، ورنہ وہ بھی آج شاہ میرے یہی کہہ رہے ہوتے۔ اس کا اللہ، اس کا رب۔ آپ کہاں آ گئے ہیں دادا! کیوں اپنے بے پناہ شعور کو بدگمانی کی چار دیواری میں جہالت کی میخیں گاڑ کے قید کرلیا ہے؟'' وہ ششدر سے رہ گئے، مڑے۔

''آپ کو میرے ساتھ گفتگو کرنی ہوگی دادا!''

''کیا بات کروں؟'' وہ پھٹ پڑے۔ ''اپنے گرد نظریں گھماؤ، تمہیں بے بسی ہی نظر آئے گی، اللہ کی رعایا میں۔''

''یہ بھی ناپختہ عقائد ہی کی بدولت ہے۔ کوئی یقین کے ساتھ پکارے تو۔'' وہ دوبدو بولا۔ دادا دہکتی آگ سے جاگے۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، اس سرکاری ہسپتال کے برف کور یڈور میں، میں نے رب کو پکارا نہ ہوگا۔ میں نے جو چار کتابیں تمہیں دیں، ان کو پڑھ کر تمہیں لگتا ہے کہ عالم بن گئے۔'' وہ کراہ کے رہ گیا۔ آنکھیں پانیوں کی مکین ہوگئیں۔

''اللہ آپ کے شکوے دور کرے۔'' دادا چلتے رہے۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہوگئے اور ہر طرف سبزہ ہی رہ گیا۔ فرانسیسی گڈریے نے تان لگائی۔

''اور خداوند کی نعمتیں مشروط نہیں۔ وہ خلوص سے تمہیں سنتا ہے۔''

ریس کی آنکھ کا پانی اور شبنم کا قطرہ سارا سبزہ چوس گئے۔ ریس ایلوویرا کی ٹوکری اٹھائے کچن میں چلا گیا کیونکہ دنیا سب مشروط ہی دیتی ہے۔

☆☆☆

میں جلد ہی اس شیطان کو بھول گئی۔ زندگی مسائل سے بھری پڑی تھی۔ اسٹیورٹ مجھے دیکھتا تو مغلظات بکنے لگتا۔ ممی فراغت ملتے ہی مجھے کسی پراجیکٹ کا بتانے لگتیں۔ ایسے میں خاموشی اندر باہر گونجنے لگتی۔

اس روز بھی برف باری ڈھیٹ مہمان کی طرح بیٹھی پڑی تھی، جب یونیورسٹی سے واپسی پر کوئی بھاگ کے میرا ہم قدم ہوا۔

''ہائے۔'' میرے ماتھے پر بل پڑے۔ اودے رنگ کے ہڈ سے چہرہ ڈھکا ہوا تھا جبکہ ہیڈفونز گردن میں جھول رہے تھے۔

''چونکہ ایک سوال مجھے خاصا بے چین کر رہا تھا، سوچا پوچھ ہی لوں۔'' خواہ مخواہ فلمی سا وقفہ دیا۔

''کیا اب تمہارے گھر ویسا کچھ نہیں ہوتا جس کی ویڈیو وائرل ہو جائے اور تمہارے چہرے پر پہلے جیسی ہوائیاں اڑ سکیں؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''اگر میں کچھ ڈھونڈ لوں۔'' میرے قدم اب رکے تھے۔

''تو یقین جانو، میں کیمرے کے ساتھ ساتھ تمہارا منہ بھی توڑنے کی ہمت رکھتی ہوں اب۔''

''آہ...... یقین مانو مدت بعد کسی کا لہجہ اچھا لگ رہا ہے۔ تمہارے یہ جرأت کے مظاہرے مجھے اتنی خوشی دے رہے ہیں، جتنی میٹروپولیس کے چیف کو تمہارے ممی ڈیڈی کے گھر چھوڑ جانے کی ہوئی تھی۔ ویسے تو میری ممی اسٹیٹ اٹارنی کا الیکشن لڑنے والی ہیں اور مجھے ان کے سیکریٹری سے مصروفیات کم اور دوستیاں محدود کرنے کا حکم مل چکا ہے مگر تمہاری بات کچھ اور ہے۔ ہم تو بچپن کے دوست ہیں۔ آل رائٹ۔ تو میں تم سے کبھی نہ کبھی کہیں بھی پھر ملوں گا۔''

میری کپکپاہٹ اس کی بک بک کھا گئی اور اب میں گلی میں تنہا کھڑی غصہ کھا رہی تھی۔

☆☆☆

اخروٹ کی لکڑی سے بنے گھر میں اس کی بے بسی گھومتی پھرتی، بے زاری کھیلتی کودتی اور کرب تھم تھم چلاتا پھرتا۔ خود کار وہیل چیئر پر بیٹھا گم صم وجود ہر بچپن دیتے جذبے کی اجارہ داری دیکھتا اور اپنے بہت پیارے کو ہاتھ مسلتا بھی۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہ مسلسل ٹانگ جھلاتا اور پیر کا انگوٹھا، ہاتھ کے انگوٹھے سے مسلتا۔

''آپ کو معلوم ہے، میں نے اس پندرہ روزہ سفر کے آخری بارہ گھنٹوں میں کیا کچھ جھیل لیا؟ کتنا کچھ سیکھ لیا؟'' گم صم وجود بغور سننا چاہتا۔ وہ وجہ جو اس مرد کی آنکھ میں کیل جیسی گڑی تھی۔

''مکان بدل لینے سے دکھوں کو آپ کا پتا نہیں بھولتا اور خوشیاں اکثر آپ کی دہلیز بھولی ہوتی ہیں۔''

''جانے مجھے کس شے نے تندور بنا رکھا ہے۔ مجھ سے یہ درد سہا نہیں جا رہا۔ آگ لگے ایسی کامیابیوں کو۔'' وہ عراقی نوحہ کناں عورت دکھتا۔

''غرق ہوں ایسے ایڈریس جس پر بلا کے وہ مجھے اپنے بچوں سے ملوائے گی۔ میں نیویارک کی برفیلی سڑکوں کو گواہ کر آیا ہوں کہ مجھے ماضی سے غرض نہیں کہ میری پوریں تو حال کو سہل کرنے میں ہی فگار رہتی ہیں۔ مجھے وقت سے کچھ واپس نہیں چاہیے۔''

وہ ایک اڑیل مہم جو لگتا۔ ایک ضدی سپہ سالار بھی......

☆☆☆

''تم نے زندگی سیکھنی ہے؟'' بالائی منزل سے دادا کی عجب اصطلاح سنائی دی۔ دادا کے فارم ہاؤس کا بوسیدہ گودام تھا یہ۔

''اوپر آؤ...... تمہیں زندگی دکھاتا ہوں۔'' وہ پرجوش ہوا۔ لکڑی کی ذرا چوڑی سیڑھی پر پاؤں دھرتا وہ جوں ہی بالائی منزل کے نزدیک ہوا، غلیظ بدبو نے نتھنے جلا ڈالے۔

دادا قہقہہ لگاتے، ہاتھ بڑھا کے اسے اوپر اٹھانے لگے۔ پلنگ جتنے بڑے لوہے کے برتن میں گلتے سڑتے کالے انگور، عمل تخمیر کے عمل سے شراب کشید کرنے کا طریقہ۔ وہ الجھے کے دادا کو دیکھنے لگے۔

"پچھلے سال میں نے تمہیں ڈارون کے ارتقائی عمل والی کتاب پڑھنے دی تھی۔"

"جی پڑھی تھی میں نے۔" وہ ناک دباتا بولا۔

"لب لباب یہی تھا کہ قدرت کی طرف سے ایک ایسا نظام وضع کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے وقت بدلتا ہے، مخلوقات میں کچھ تبدیلیاں رونما ہو کے انہیں وقت اور حالات کے مطابق موزوں کرتی رہتی ہیں۔"

"جی!" وہ اکتا رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے میرے بچے! زرافہ پہلے چھوٹی گردن والا جانور تھا پھر....."

"معلوم ہے دادا۔ خوراک کی کمی نے اسے گردن اونچی کر کے درختوں کے پتے کھانے پر مجبور کیا یوں لمبی گردن والے جانور آ گئے اور خوراک کی کمی سے چھوٹی گردن والے مرتے گئے۔" وہ جلدی جلدی بتانے لگا۔

"یہ تو سائنسی کہانی ہے پوتے! زندگی کی کہانی میں چھوٹی گردن والے آسانی سے مر گئے؟ لمبی گردن والے آتے ہی خود کو منوا بیٹھے ہوں گے؟" وہ رک گیا۔ دادا کو دیکھنے لگا۔ دل دھڑکا۔ کیا سمجھانے والے ہیں وہ۔

"یہ ہے زندگی کی کہانی میرے بچے۔" دادا نے بانہیں پھیلا کر گلتے سڑتے انگوروں سے متعارف کروایا۔

"گلو سڑو! جیسے بھی مگر اپنی ہیئت بدلو۔ جیسے بھی ہو..... چاہے خود کو ختم کرنا پڑے کرو مگر ایک عمل سے خود کو باہر نکال کے مت بیٹھ جاؤ۔ ورنہ ان باہر پڑے اکا دکا انگوروں کی طرح کھال جلا کے ختم ہو جاؤ گے اور کچھ بھی نہ کہلاؤ گے۔" وہ ساکت دادا کو دیکھتا رہا۔

"لمبی گردن والے زرافوں نے کیا کچھ نہ سہا ہوگا۔ وہ رد کیے جاتے ہوں گے، حملے کیے جاتے ہوں گے۔ لطیفہ بنائے جاتے ہوں گے مگر وہ قائم رہے کیونکہ وہی فطری تھے۔ قائم رہنے کو بنائے گئے۔ جب مکمل قائم ہو گئے تو سب بھول گئے، بھی پست گردن والے بھی ہوا کرتے تھے۔ اور یہی زندگی ہے ناں؟ تسلسل..... یہی تو زندگی ہے۔ ڈھٹائی یہی تو زینہ ہے زندگی کو فتح کرنے کا۔"

وہ چند قدم پیچھے ہوا۔ دادا پریشان ہو گئے۔

"لمبی گردن والے زرافے کا تجربہ غلط تھا۔ یہی تو ڈارون نے سمجھایا تھا دادا۔" وہ تیزی سے پیڑ چھلانگ اترا اور گودام میں سوکھتی گھاس کو پریشان کرتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ الجھے بالوں سے بولا۔

"مجھے واپس جانا ہے دادا۔"

"کیوں اتنی جلدی اکتا گئے دادا سے۔"

"نہیں، اکتایا نہیں۔ بس سیکھ گیا ہوں جو آپ نے کل سمجھایا تھا کہ سب میں رہوں ورنہ کھال سوکھ جائے گی اور بنے گا کچھ بھی نہیں پھر لمبی گردن والے زرافوں نے بھی تو تضحیک سن کے ہی خود کو منوایا ہوگا۔"

"رئیس میری جان..... میرا بیٹا....."

"میں ناراض نہیں ہوں دادا۔" وہ تھک کے بیٹھ گیا اور دادا نے بات ختم کر دی۔

ہاشم ولا کی بیل دباتے وہ لمبی گردن والا زرافہ بن گیا۔ بے زبان..... اکیلا..... اداس آنکھوں والا زرافہ۔

☆☆☆

یونیورسٹی فیئر (میلے) میں رنگ گنتی پھر رہی تھی۔ رونی، ابراہام کے ساتھ مصروف تھی۔ ابراہام نے قدیم طرز کے بنے زیورات کا اسٹال لگایا تھا۔ یوں میں گھومنے کو اکیلی بچ گئی۔

بڑی بڑی کھڑکیوں، دروازوں اور روشن دانوں

والے برآمدوں سے گزرتے میں قہقہوں کے سیلاب کو شور مچاتا دیکھ رہی تھی مگر یادداشت کی مشین کی کھٹ کھٹ.....اف۔

تب کرنی مشین کو کھولنا پڑا۔ اندر کل رات والا واقعہ پھنسا پڑا تھا۔ مشین کو صحیح چلنے نہ دیتا۔ میں واقعہ نکالنے لگی تو آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔

"یہ اٹھارہ سال کی پچھلے سال ہی ہو چکی ہے۔ چاہے ماڈلنگ کراؤ یا جاب، مجھے اس کی کمائی چاہیے بس۔ تم ماں بیٹی پر لٹا لٹا کے میں تھک گیا ہوں۔" سپورٹ کی شکل میں لیوا تھن اب باقاعدہ میرے گھر آ گیا تھا۔ میری ماں نے پوروں پر اپنی کمائی گنوائی تو بولا۔

"بس اب اپنی کمائی سے بیٹی کو گھر بھی خرید دو۔ ں ڈربے میں میری پرائیویسی بھی رہی ہی نہیں۔ ں اپنے کسی دوست کو نہیں بلا سکتا۔ پارٹی نہیں کر سکتا۔ پچھلی کرسمس پر بھی لوگوں کو وضاحتیں دیتے لا سوکھ گیا کہ ہماری بیٹی کدھر غائب ہے۔" وہ بلائے، پلے کے جیسا گھنٹوں چیختا ہمیشہ۔

"میں ذیک سے رابطہ کر رہی ہوں اور....." ی نے تسلیم کر ہی لیا کہ وہ مجھے مزید ڈھو نہیں سکتیں۔ دداشت کی مشین سے آوازیں آنا بند ہوئیں تو مگن ی چلنے لگی۔ "کام ڈھونڈنا ہوگا" اور پھر.....

"ہاؤ....." دل زور سے دھڑکا تھا۔ خوف سے تیب بھول گیا۔

اسپائیڈر مین کا ماسک اتارتے ڈینی کو دیکھتے ہی میرے ہاتھوں میں خون نہیں جہنم سی آگ دوڑ گئی۔ یہ آناً فاناً ہی ہوا تھا کہ میرے مکے نے ڈینی کو ناک پر ہاتھ رکھتے جھکا دیا۔ بھل بھل خون نکلا تو میرے حواس نے شرمندگی محسوس کی۔ پھر میں نے مدد کا مرحلہ پورا کیا۔ اب وہ اور میں قدرے تکلف سے گھاس پر بیٹھے تھے۔ کافی کی چسکیاں لیتا ڈینی مجھے دیکھتا تو کبھی ناک پر رکھے رومال کی جگہ بدلتا۔ خون رس رہا تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ دراصل خوف نے مجھے کچھ سوچنے نہیں دیا۔"

"اوہ کوئی بات نہیں کیلہ ڈیرا میں بس تمہارے مردانہ وار کا معترف ہوا ہوں۔ کہاں لوہا کوٹتی رہی ہو؟"

مجھے نہ چاہتے بھی ہنسی آ گئی اور یوں شیطان پری کا دوست بن گیا بالآخر۔ ہم سڑکوں، بازاروں، دکانوں میں ٹکراتے پھر گھومنے لگتے۔ پاپ کارن یا آئس کریم کھانے لگتے۔ اسکیٹ شوز پہن کے رستوں پر ادھم مچاتے۔ اک دوجے کو دھکے دیتے، منہ کے بل گراتے پھر اپنی جیکٹ مفلر سے دوجے کو جھاڑتے۔ بال سنوارتے۔ بے تکلفی نے دنوں میں سالوں جتنا سفر کر لیا پھر ایک دن.....

"ڈینی! مجھے کوئی جاب چاہیے۔" آئس کریم کون کو اپنے منہ کے سامنے جما کے میں نے کہہ ہی دیا۔

"کوئی بھی چلے گی؟" میری ہلتی گردن نے تکلف کی آخری پرت کے پار کی دنیا بھی دیکھ لی۔ بے لوث دوستی کی دنیا۔

ڈینی نے تھیٹریکل ایجنسی میں جاب دلوائی۔ مختلف روپ دھارنے کا کام تھا، دلچسپ تھا اور رقم معقول۔ میں خوش ہو گئی۔ ڈینی کو خوشی میں ڈنر کروایا اور وہ لوکل میٹرو سے مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔

"وہ حرام زادی آدھی آدھی رات گھر سے باہر رہے اور میں باؤلا کتا ہوں جو بھونکتا رہوں یا رکھوالی کرتا ہوں۔" اسٹیورٹ لحاظ کھو چکا تھا۔

ڈینی نے مجھے دیکھا اور قہقہہ لگا کے ہنس دیا۔ جانے کیوں مجھے وہ قہقہہ پرانا نہ لگا۔ میں ہنس دی۔ قہقہے میں حوصلہ دلاتی تسلی جو تھی۔

"میں اپنا ٹیبلٹ لانا بھول گیا، پتا بھی تھا کہ تمہارے گھر جانا ہے۔" دونوں ہنسے۔

میں اندر کو بڑھنے لگی تو ڈینی نے میرا بیگ پیچھے سے تھام لیا۔ جیب سے پین نکالا اور بیگ پر کچھ لکھ دیا۔ پھر تیز قدموں سے واپس مڑ گیا۔ اس رات میں نے اسٹیورٹ کی گالیوں کو جاگرز تلے روند کر جلدی اوپر جانا

چاہا۔ بیگ کندھوں سے اتار کر سیدھا کیا تو......

"میکنم اسٹریٹ مکان نمبر 125، نیویارک۔"

سالوں بعد میری آنکھوں نے نمکین پانیوں کی نمی محسوس کی۔ ڈینی نے اس کی رہائش بھی دیکھ لی۔ وہ گھر سے نکالے جانے کے بعد اپنی رہائش پر رہنے کی دعوت لکھ گیا تھا۔ مجھے ڈینی پھر کبھی شیطان نہیں لگا۔

☆☆☆

نومبر کا اختتام یقینی تھا۔ سمیعہ آنٹی اور شاہ میر کا ڈنمارک رئیس کی آزادی کا اقرار نامہ۔ وہ پارک چلا جاتا۔ لائبریری میں وقت گزارتا یا پھر اذہان کے ساتھ ویڈیو گیمز کھیلتا۔ دماغ زندہ تھا۔ روح پرسکون...... اور اک دھند زدہ شام کو وہ زیتون میں بنی اسنیکس، لیے مسز کرنل سے ملنے جا پہنچا۔

وہ رئیس کا گال تھپتھپاتی فرمائش کرنے لگیں۔

"گارلک بریڈ ہی بنا جاؤ رئیس! تمہارے ہاتھ کی عمدہ اور خستہ بریڈ......"

وہ برتنوں میں مصروف ہوگیا تو آواز دب گئی۔ بریڈ کا آمیزہ اوون میں رکھا۔ وقت لگا کے کچن پیپر سے ہاتھ پونچھتا باہر نکل آیا۔

"یوں لگتا ہے مدت ہوئی سمیعہ کے گھر کھانا کھائے۔" کتاب بند کرتے چشمہ اتارتے، وہ گفتگو کے لیے تیار ہوئیں۔

"اس عمر میں آرام بھی تھکا دیتا ہے اور یہاں لاڈلے نے اپنی بگڑی کی ذمہ داری دے ڈالی ہے۔"

رئیس نے محتاط انداز میں دیکھا کہ وہ بگڑی بالائی منزل کے ستون سے لپٹی کھڑی ہے۔ مسز کرنل ایک خاندانی سامع کے سامنے فاش ہونے کو تیار تھیں۔

"وہ ہے کہ سنبھلتی ہی نہیں۔ روز نیا مسئلہ۔ روز نیا ذہنی کرب۔ ہمارا بیٹا تو کبھی ہمارا تھا ہی نہیں۔ ہم سمجھ بیٹھے تھے کہ اس کی بھی ہمارے طرح اولاد نہ ہوگی اور اب یہ ہالہ...... اف۔ رئیس میری نس پھٹ جائے گی اس کافر عورت کی اولاد کو جھیلتے جھیلتے۔"

رئیس خان زادہ شرمندہ سا ہوا تھا۔ موضوع بدلنے لگا۔

"آپ ڈاکٹر کو دکھا لیتیں۔" وہ اگر ... پھٹ پڑیں۔

"ارے کہاں لڑکے، ڈاکٹر کے پاس جاؤں یا اس نیم پاگل کی رکھوالی کروں۔ کرنل صاحب نے سختی سے منع کیا ہے، اسے گھر سے نکلنے کو اور مجھے اس کے ساتھ رہنا ہے۔ سچ پوچھو تو خوف آتا ہے اس سے۔ نیم مردہ لڑکی ہے۔ جانے کیسی کافر ماں ہے جس نے نوچ کے پھینک ڈالا خود سے دور۔ نہ دین کا علم نہ مذہب کی پہچان، یہ لڑکی......" بالائی منزل سے گرتے شیشے کے گل دان نے سارا فرش کانچ سے بھر دیا اور مسز کرنل کی حواس باختگی ابھر آئی۔

"میری ماں کافر نہیں ہے۔" وہ چیخی تھی۔ دھڑ دھڑ کرتی وہ نیچے اتری۔ جانے کیوں لگا کہ وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی۔ وہ بولنا چاہتی تھی۔

"سمجھیں آپ......" وہ ہذیانی انداز میں اردگرد کی ہر شے تباہ کرنے لگی۔

"میری ماں کافر نہیں ہے...... آپ کا بیٹا کافر ہے۔ ہر وہ شخص کافر ہے جو دنیا کی کسی منڈی میں اولاد پر "برائے فروخت" لگا کے اسے تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ ہر وہ شخص کافر ہے جس کی اولاد تاریکیوں میں ہچکیاں لیتی ہے اور وہ بے آرامی کی ایک کروٹ تک نہیں لیتا۔ ہر وہ شخص کافر ہے جو اولاد کو الف تک نہیں سکھاتا اور زندگی جیسے بڑے کمرہ امتحان میں دھکیل دیتا ہے۔ میری ماں کافر نہیں تھی...... بس وہ روپوں کے ڈھیر لاتی رہی اور میں کہیں نیچے ہی دب گئی۔ آپ مجھ سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ کیا ہوا تھا؟"

وہ بلک بلک کے رو رہی تھی۔ تھک رہی تھی۔ جبکہ رئیس دم بخود کو بولتا سن رہا تھا، وہ رئیس ہی تو تھا۔

"آپ کو مجھ پر ترس کیوں نہیں آتا۔ پیار کیوں نہیں آتا۔ کچھ بھی کیوں نہیں آتا۔" اس کے گلے کی خراشیں، رئیس کو تکلیف دے رہی تھیں۔ اس کی زخمی انگلیاں مسز کرنل کو پتھر کر رہی تھیں۔ باہر بارش تیز تر تھی۔

اب ہالہ اپنی سہیلیاں تھامے زمین پر بیٹھی تھی۔ بول رہی تھی، رو رہی تھی اور پسلیوں پر ہاتھ رکھے کراہ

رہی تھی۔ مسز کرنل سر ہاتھوں پر گرائے رو رہی تھیں۔
ب رئیس خان زادہ کسی ماں سی بے آرامی میں مبتلا
ہو کے اٹھا کہ جس کی اولاد ایڑیاں رگڑ رہی ہو۔
وہ چپکے سے ہالہ کے قریب جا بیٹھا تھا اور اس کا
ر اپنے سینے سے لگایا۔ ہالہ روتی رہی یہاں تک کہ
ڑھال ہوگئی۔ وہ اسے ساتھ لگائے اٹھا اور مسز کرنل
کے بیڈروم میں لے گیا۔ مسز کرنل اسے تھپکنے لگیں تو وہ
دھ آنکھوں سے بولی۔
"کون ہو تم؟" وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔
اب وہ مسز کرنل کے مقابل لاؤنج میں بیٹھا تھا۔
"میں اس کا علاج کروں گا اور آپ لوگ اس
ے پیار۔ وہ کافر عورت کی بیٹی آپ کے وجود کا حصہ
د میں رکھتی۔ آج معلوم ہوگیا؟" گھر سے جانے
تنے بلاوے آئے تھے۔ وہ فوراً پہنچا۔
"کرتا ہوں تیرا بھی کچھ۔" نانا بڑبڑاتے
ر رہے تھے۔ وہ تھکن زدہ سا اکیلا کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

اس رات پورا نیویارک سٹی جل تھل تھا۔ ممی بھی
سٹیورٹ کی زبان سے لڑتے لڑتے بے دم ہوگئیں تو
ں نے خاموش رہنا بے وقعت جانا۔
"کیا تم بتاؤ گے کہ مجھے مزید کیا کرنا ہوگا اس
گھر میں رہنے کے لیے؟ کیونکہ کمائی تو کر ہی رہی
وں۔" اسٹیورٹ سمیت ممی بھی میرا طنز سمجھ گئیں اور
ضرورت سے زیادہ زرد بھی ہوگئیں۔
"زبان چلاتی ہو۔" اسٹیورٹ نے طمانچہ مارا۔
"چند ڈالرز کما کر مجھے چندہ دیتی ہو جو آج
آنکھیں دکھا رہی ہو۔" وہ مجھے لاؤنج میں گھسیٹنا چاہتا
تھا شاید مگر میرے گھونسے نے اسے لڑکھڑا دیا۔
"زور بازو سے کماتی ہوں، تمہیں اس گھونسے
سے اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔"
مجھ میں جیسے آفاقی قوتیں آن بسی تھیں، جو
اسٹیورٹ چپکا بیٹھا رہا۔
"اور آپ....." میں ممی سے مخاطب ہوئی۔
"آپ ڈھونڈ لیجیے گا ڈیڈی کو۔ میں آپ سے رابطے میں
رہوں گی اور اب چھوڑ دیں اس شیطان کی پوجا۔"
اسٹیورٹ نشے میں نہ ہوتا تو یقیناً معاملہ طویل تر
ہو جاتا۔ یوں میں میکنم اسٹریٹ کے مکان نمبر 125
کے سامنے کھڑی تھی۔ دروازہ الجھے بالوں والے
لڑکے نے کھولا، خوب صورت بلا کو دیکھتے ہی جماہی
جیسے جم ہی گئی۔ میں ساکت اسے بالوں میں انگلیاں
چلاتے دیکھتی رہی۔ باہر بارش نامی پانی جانے کہاں
سے آتا اور کہاں جاتا رہا۔
"جون تو سو گیا ہے۔" وہ میرا سامان ملاحظہ
کرتے کہنے لگا۔
"ڈینی کو بلاؤ۔" بے تاثر ہی رہی۔ لڑکا بری
طرح چونکا۔
"پہلے قسم کھاؤ کہ تم اس کی گرل فرینڈ نہیں ہو۔
ہے کرائسٹ یہ کس قسم کا مذاق ہے یار۔" وہ اوپر
دیکھتے شکوے کرنے لگا۔
"تم بلاتے ہو یا میں تمہیں بتا دوں کہ اس ہاتھ
سے ابھی ابھی میں کسی کی ناک پھوڑ کر آ رہی ہوں۔"
"کیلہ! یہ تم ہو۔" آواز ڈینی سے پہلے دروازے
تک آئی۔ میرا سامان دیکھتے ہی وہ کھلکھلایا۔
"تم مجھے بلا لیتیں میں تمہیں لے آتا اور ایک
عدد ویڈیو بھی۔ بچپن کی یاد تازہ ہو جاتی۔" وہ میرا
سامان اٹھاتا، آگے چلتا بولتا رہا۔
"خدا تمہیں پوچھے لوہے کے ٹیڈی بیئر۔"
الجھے بالوں والا بڑبڑاتا کمرے میں چلا گیا۔ اب ڈینی
میری طرف مڑا۔ فکرمند دکھتا۔
"ٹھیک ہو؟" اف میں کیوں اسے شیطان کہتی
رہی۔
"میں نے اسٹیورٹ کی ناک پھوڑ دی۔" میں
نے ہاتھ آگے کیا جس پر خراش تھی۔
وہ خاموش رہا پھر کچن میں گیا۔ اپارٹمنٹ اپنے
چار دوستوں کے ساتھ شیئر کرتا تھا وہ۔
وہی ہالی وڈ کے بگڑے رئیس زادے۔ کافی اور
سینڈوچ کھانے کے بعد میں ڈینی کے کمرے میں اور
وہ سیٹنگ روم میں سویا تھا۔ یوں میں چلتے چلتے ڈینل

کلارتھ کے رحم و کرم پر آ گئی تھی۔ میں یعنی کیا۔ ڈیک......

☆☆☆

لاہور کی فضا میں کچھ اور سرد پن اتر آیا تھا۔ جب وہ املی کی ٹنڈ منڈ شاخوں والے درخت کے تنے کے پاس کھڑا کہتا تھا۔

''یہ کارن سوپ ہے۔ یہ تمہارا اپنا یورم بڑھا دے گا۔ یہ پی لو۔'' ہالہ اسے گھورتی۔

''تم جاؤ، یہاں سے۔'' اکتاتی۔

''تم نے مانا تھا کہ ہم دوست ہیں۔''

''ہم دوست نہیں ہیں۔ اب یہ مان لیا ہے پھر؟''

''تم مررہی ہو۔ ٹھیک...... مرنا ہی ہے تو میرے تجربے میں کچھ مدد ہی کر جاؤ۔ میں دراصل خوراک سے ڈپریشن کا علاج ڈھونڈ رہا ہوں۔'' وہ ہانکتا۔

''سب ایک ہی دوڑ میں لگے ہیں...... مطلب کی دوڑ میں۔''

''میں تمہیں مسلمانوں کی کتابیں سناؤں۔'' وہ اس کھلونے کو تین دن سے بہلا رہا تھا۔

پہلے ہفتے زود ہضم خوراک...... دوسرے ہفتے تقویت بخش، تیسرے ہفتے صحت بخش اور آخری ہفتے صرف میٹھا۔ وہ سب کسی اندھے گداگر کی طرح نہیں بلکہ کسی دانا حکیم کی طرح کر رہا تھا۔ کتابیں، انٹرنیٹ اور مشورے وہ ہر مہارت سے لیس ہو کر باقاعدہ گوشوارے بنا کر اس میدان کو سر کرنے نکلا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ کسی کام کے لیے پرجوش ہوا تھا۔ مگر وہ لڑکی کسی یونانی فلاسفر کی طرح ڈھیٹ تھی۔ اب وہ سورۃ مزمل مکمل لحن کے ساتھ تلاوت کر رہا ہے اور وہ لڑکی سوپ کا چمچ پرے رکھ کر پیالہ منہ کو لگا چکی تھی۔

رئیس خان زادہ دیکھ رہا تھا، خزاں سے لڑتی زمین سے اگتی ہوئی امید......

☆☆☆

''تم مجھے ایسے ناشتا کروانے والے ہو؟'' میرے انداز میں کچھ ایسی منہ پھٹ حیرت ضرور ہو گی کہ جس نے بٹوے میں سے پیسے نکال کر اسے پھینکتے

ایلی کو پلیٹ چاٹنے [illegible] سایا تھا۔ [illegible] دیکھنا یہ تو [illegible] ہوں گے۔ دراصل میں تمہیں [illegible] ہوں محترمہ۔'' [illegible]

''تم ہائٹ مار کے لوگوں کی [illegible] لے جا رہے تھے [illegible] کرلیا۔'' کوئی شک نہیں [illegible]

''یہ بات ہے تو [illegible] کوئی ہاسٹل یا اپارٹمنٹ [illegible] لیے ایڈوانس رقم بھی بھر دی ہوئی۔'' [illegible] سے گزرتے امریکی کی کیپ [illegible] اڑائی تھی اور میرے سامنے اڑائی تھی۔

''تم......'' میرا منہ کھل گیا۔

''تم یہ سب کرنا سیکھ لو میڈم۔ یا پھر [illegible] برداشت کرنا سیکھ لو کہ اب سے تم میرا [illegible] جاؤ گی نیویارک میں۔''

تب میں تنتنا کے رہ گئی مگر پھر ہم گلیوں میں [illegible] پھرتے اور وہ مجھے کو سکھا رہا ہوتا۔

''دیکھو دونوں انگلیوں کے سرے جیب [illegible] جاتے ہی کھلیں۔ ٹارگٹ کو پکڑیں اور باہر [illegible] مگر...... انگلیاں بے زبان ہونی چاہئیں۔ [illegible] میرا والٹ نکالو۔'' وہ آگے چلنے لگتا۔

''تم مجھے گدگدی کر رہی ہو؟'' وہ کبھی [illegible] کنفیوز سا پوچھتا اور کبھی دھاڑتا۔

پھر ایک دن جب اسے کسی کے والٹ سے [illegible] سو ڈالر ملے وہ یوں خوش ہوا کہ کیا ہی ارسطو، سکندر اعظم کی فتوحات سے خوش ہوا ہو گا۔

ڈینئل کلارتھ کی ماں، سارہ کلارتھ [illegible] وکیل تھی۔ اب کنیکٹی کٹ ریاست کی اٹارنی کا [illegible] لڑ رہی تھی۔ ڈینئل بھی Yale میں قانون پڑھ رہا تھا۔

چونکہ وہ Juvenile Justice (بچوں کے لیے انصاف) کے سبجیکٹ میں اسپیشلائزیشن کر رہا تھا۔ وہ بھی اپنے قانون دان خاندان کی خواہش اور مشورے کے خلاف۔ پس وہ خاندان بھر

میں ناپسند کیا جاتا۔ وہ من موجی تھا۔ کبھی تھیٹر کرتا۔ کبھی پرمشقت جم کر کے جسم بنا رہا ہوتا۔ کبھی ہالی وڈ میں اسٹنٹ مین بنا ہوتا۔ تو کبھی ہائی پروفائل پارٹیز میں بن ٹھن کر چار ہا ہوتا اپنی لکس کیش کروانے.....

میں خوش تھی ڈینی نے اپارٹمنٹ کرائے پر لے دیا جس میں دو اور لڑکیاں ہوتی جاب اچھی جا رہی تھی۔ عیش ہم اپنے طریقے سے پورے کر لیتے۔ زندگی سکون بھری اونگھ لے رہی تھی کہ جب مجھے لگنے لگا۔ ڈینی کو محبت ہے مجھ سے..... مجھے لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

''اداس ہو؟'' وہ میرے لیے متفکر ہوتا۔

''تم نے ابھی تک اپنا فر کوٹ نہیں خریدا؟'' وہ نچھاور ہوتی ماں بن جاتا۔

''رونی کا بوائے فرینڈ کوکین ڈیلر ہے نیو جرسی میں.....'' گوسپ کرتی شرارتی دوست بن جاتا۔

''یہ مفلریوں بھی پہنا جا سکتا ہے۔'' وہ برہنہ کندھے ڈھانپتا باپ محسوس ہوتا۔

''جرنلزم تمہارے جیسی پارہ صفت کے لیے پرکشش ہے۔'' وہ کیریئر کونسلنگ کر رہا ہوتا۔ ہلٹن میں کھانا، مے فیئر اور ہالی وڈ کی سیاحت..... ڈینئل کلارتھ ایک شکنجہ تھا یقیناً اور میں..... جس کی پیدا کردہ تنگا۔ تنہا..... بدحواس، روشنی کو ترستی مجھے ڈینی کے سوا کچھ نہ سوجھتا۔ وہ آنکھ سے محبت کرتا۔ امریکا میں ایسی مشرقی محبت نایاب ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' میرا دل یوں دھڑکتا جیسے اس کی آنکھ سے شرط لگا بیٹھا ہو۔

''تم موٹی ہو رہی ہو۔'' وہ منہ بسور کے کہنا اور اگلا ڈیڑھ گھنٹہ میں سنتی رہتی۔

پھر ایک وہ رات آئی تھی کہ جس سے ایک دن پہلے ڈینئل نے سینٹرل پارک میں اسکیٹنگ کرتے میرا ہاتھ تھاما۔ اپنی رفتار میری رفتار کے برابر کی اور بولا۔

''کل میری ایک پروفیشنل گیدرنگ ہے اور تم چل رہی ہو۔ ٹھیک آٹھ بجے میں تمہیں لینے آؤں گا۔ لباس سیاہ ہونا چاہیے۔'' میری جیکٹ کندھے سے جھٹکا دے کر اس نے رفتار بڑھالی اور میں اوندھے منہ سڑک پر گری تھی۔ ٹخنے پر چوٹ آگئی۔ وہ شرمندہ ہوتا رہا اور میں پارٹی میں جانے کے لیے بے تاب..... بے چاری میں۔

☆☆☆

عکاشہ آئی تو ٹوک بیٹھی۔

''مسز کرنل آج کل کچھ زیادہ ہی فریفتہ نہیں تم پر؟ جب دیکھو تم ان کے بنگلے میں جب سنو ہالہ نامہ یاد رکھنا اس نیلے آسمان نے جانے کتنے بلند پرواز دیکھ رکھے ہوں۔ اسے نہ کسی کی لگن سے فرق پڑتا ہے نہ پروں کی چھوٹائی سے۔'' وہ لاؤنج میں تادیر بیٹھا عکاشہ کی بات سوچتا رہا۔

ٹھنڈ جوان ہوگئی اور سرما تند، وہ اور اذہان مونگ پھلی کھاتے اور ہالہ سے کبھی لمبی گفتگو کرتے۔ وہ اب کبھی کبھی مسکرا دیتی..... کبھی کچھ بول بھی دیتی۔

ماہا ادریس کو اس کی ہنسی۔

''تم اسے گود کیوں نہیں لے لیتے۔'' وہ نہال ہوا۔

''دادا کہتے ہیں کہ جب کوئی تیسرا چبھنے لگے تو سمجھو ''دو'' کا ''سمجھوتا'' کوٹا اور محبت شروع ہوئی۔'' وہ ہونہہ کر کے رہ گئی۔

☆☆☆

وہ رات کو بے مقصد ٹہلتا تھا۔ بالکونیوں باغیچوں اور چھتوں پر۔ جیسے کوئی بے وزن برتن ہوا سے لڑھکتا پھرتا ہے۔ یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں۔

وہ ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ اڑسے..... سلیپرز پہنے بنا سوئیٹر پہنے چھت پر دائیں بائیں گھوم رہا ہے جب سوچتا ہے کہ تھکن ضرور کسی تنہائی کی اولاد ہوگی۔ نسوں میں ہنگامہ کرتی تنہائی کی اولاد..... ویسی ہی سورش پسند..... شیطان کی پسندیدہ۔

''تمہیں معلوم ہے میں رات کے اس پہر بے آرام لوگوں کو انتہائی ناکام سمجھتی ہوں۔''

وہ مڑا، مسز کرنل کی چھت پر کھڑی وہ کافی کے

مگ سے ہونٹ لگائے سرد نگاہیں اس پر ٹکائے منتظر سی تھی۔ وہ مسکرا نہ سکا...... اپنی مریضہ کے سامنے۔

"بے سکونی صرف ناکام لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ ناکامی ناآشنائی نہیں ہے میرے لیے۔" منڈیر پر بیٹھ کے بولا۔ وہ کافی کا مگ درمیان میں رکھتی اچک کے بیٹھی۔

"کافی کی اجازت نہیں ہے تمہیں...... کم از کم اس ہفتے۔ یہ ڈی ہائیڈریٹ کرتی ہے اور ڈپریشن کے لیے ڈی ہائیڈریشن پہلا زہر ہے۔"

"کیا میرا ہی سوچتے رہتے ہو؟" وہ سرد سا اکتائی۔

"تمہارا نہیں اپنا، دادا کہتے ہیں زندگی میں ایک بار آپ کو خود کے ساتھ اچھا کرنے کا موقع بھی ملتا ہے کیونکہ ایک بار آپ کو اپنا آپ بھی ملتا ہے انسانوں کی بھیڑ میں۔"

"میں...... میں تم ہوں؟" خاموشی نے ہر شے کی زبان باندھ دی اور اندھیرا آنکھیں جھپک کے روشنی ڈھونڈنے لگا۔

"تم نے خود کو روتے نہیں دیکھا ناں...... وہ واویلا میرے دکھوں کا ہی تو خلاصہ تھا۔ وہ چیخیں میرے اندر ہی تو کرلاتی تھیں۔ میں نے خود ہی سنا۔ خود کو ہی دیکھا تھا تم میں۔"

ام ہالہ ذکریا نے لاہور کی سرد ترین رات میں اپنے آپ سے برف جھڑتے خود دیکھی۔ وہ برف تب تک جھڑتی رہی جب تک وہ لاوا نہ ہوگئی۔

وہ بول بول کر تھک گیا تو ہولے سے کہہ گئی۔

"تمہیں پتا ہے۔ تم بالکل خوب صورت نہیں ہو۔"

وہ آنکھیں میچ کے مسکرایا۔

"یہ بھی بہترین ہوا۔ خوب صورت چہرے کے ساتھ ہانڈیاں پکاتا تو مر مر جاتا۔ اللہ بہترین منصوبہ ساز ہے۔ کوئی شک ہے؟" بے ریا سی مسکراہٹ پر وہ کھکھلائی اٹھی۔

یوں ام ہالہ جو دائرے میں گھومتی ہی جاتی تھی اس لڑکے کو اس دائرے کے بیچوں درمیان میں لا کر بیٹھی تھی۔ وہ پھر سے گھومنے لگی تھی۔ گول گول اپنے مدار میں۔

☆☆☆

مسز کرنل ہاتھ جھلا جھلا کے خوش ہوتیں۔

"رئیس...... ہالہ مجھے حیران کر رہی ہے۔ وہ زندہ لگنے لگی ہے۔ اف اور خوب صورت ہو رہی ہے۔"

کرنل صاحب اسے لاء فرم لے جاتے۔

"میری پوتی کا جرنلزم۔ کیمبرج بھی مگر یہ قانون دان کو بے یقین کر دیتی ہے۔"

وہ قابل فخر ہونے لگی۔ رئیس کا سینہ پھولنے لگا۔

شاہ میر اور سمیعہ آنٹی آئے تو وہ محتاط ہو گیا۔ وہی پرانا معمول چل نکلا۔

درخت ٹنڈ منڈ ہوئے پڑے تھے۔ قدرے سست ہو گیا تھا۔ وہ پارک میں بیٹھا دادا کی فلاسفیاں جھاڑ رہا تھا۔ وہ بغور سنتی رہی۔

"دادا کہتے ہیں کہ بچپن میں ان کی دادی نے انہیں ایک مٹی کا گلک خرید دیا۔ ان کی حرص کو اور بے مرے پن کو ختم کرنے کے لیے مگر کہتے ہیں کہ ان پر الٹا اثر ہوا۔ وہ مزید حیران ہوگئے۔ ہر وہ موقع ڈھونڈنے لگے جو گلے کو بھرنے میں مددگار ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر نفس ایک ہی جبلت پر پیدا نہیں ہوا۔ یہاں جھانکو اور اپنا راستہ ڈھونڈو۔" وہ دل کی طرف سے اشارہ کرنے لگا۔

"دیکھنا...... ماہا کو لگ نہ جائے۔" وہ دل کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔ دونوں ہنسے، توقف لازم ہوا۔ پھر بولی۔

"مجھے تمہاری پسند پسند نہیں۔ وہ خوب صورت ہے مگر محبت کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ پتھر عورت ہے۔" برملا کہا۔

"ہالہ وہ گاؤں سے آئی تھی۔ یہاں...... اس بنچ پر بیٹھ کے رویا کرتی تھی۔ مجھے دکھ ہوتا پھر میں اسے

بہلانے کے طریقے ڈھونڈنے لگا اور بس.....''
بڑی دیر بعد وہ بولی۔
''مجھے لگا یہ مہربانیاں صرف میرے لیے ہیں۔'' وہ خفا ہوئی۔ ''تمہیں معلوم ہے تم سراسر خوب صورت نہیں ہو۔ ہاں مگر خوبرو ہو۔'' وہ مسکرا دیا۔
''ایسی ہی مسکراہٹ..... تنا ہوا جسم اور قد کاٹھ..... آدھے گھنگھریالے بال..... مغرب میں لڑکیاں دیوانی ہیں۔'' وہ حیران ہوا۔
''ایسا ہی معصوم بن کے دیکھنا۔ مصروفیت والی لک..... ہاتھوں کی ابھری رگیں اور.....'' وہ شرارتی سا بولتی ہی گئی۔
''خدارا بس کرو۔ بچے کی جان لوگی کیا؟'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
''آج جانے کی ضد نہ کرو۔'' وہ ٹھنکی۔
''اوئے یہ کیا؟'' وہ مرنے کو ہو گیا۔
''دادا نے سکھایا ہے کچھ کچھ۔''
''رئیس خان زادہ آپ گھر کا رستہ بھول تو نہیں گئے آخر کو مسلسل تین گھنٹوں سے یہاں پڑے ہیں۔''
شاہ میر کے آنے پر وہ ایک لفظ مزید کہے بنا گھر کو چل دیا۔

☆☆☆

وقت کوئی برق سی بن گیا۔ ام ہالہ ذکریا نے مقامی فیشن میگزین میں جاب کر لی تھی جبکہ کسی مشہور چینل میں جگہ بنانا اس کے دادا کا خواب تھا۔ جو وہ پورا کرنے میں جتنے ہوئے تھے۔ سمعیہ آنٹی کی نواسی ہوئی تو بڑے پیمانے پر تقریب ہوئی۔
ہالہ نے خوب تیج دھج کی۔ رئیس کہیں نہ دکھا۔ وہ ڈھونڈنے لگی۔ نیوی بلو شلوار سوٹ میں بال اچھے سے سیٹ کیے پشاوری چپل میں وہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ ملازموں میں گھرا کھڑا۔
''وہ ٹراؤزر تو ماہا ادریس کی سوتن ہی تھے جیسے۔ آج اترے ہیں تو اپنا اپنا سا رئیس سامنے آیا ہے۔'' وہ آنکھ دبا کے بولی۔
''تم بھی اچھی لگ رہی ہو۔'' وہ نظریں نہ ملاتا۔ وہ ٹھنکی۔
''باہر کیوں نہیں آ رہے؟''
''ایسے ہی کام تھا۔'' اس نے کہا تو وہ اسے کہنی سے کھینچنے لگی۔ وہ ہچکچایا پھر بے بسی سے بولا۔
''میں اللہ کا پسندیدہ رہا ہوں ہالہ۔ اللہ مجھے ڈھانپ لیتے ہیں جانے کیوں؟ میں ہر عید، ہر شادی پر شاہ میر کی اترن پہنتا ہوں۔ کسی کو معلوم تک نہیں پڑتا۔ شاہ میر کو بھی نہیں۔ مگر آج اس نے پہچان لیا ہے۔ اب وہ ماہا کے سامنے..... وہ واقعی موقع ڈھونڈے گا۔'' وہ لب دبا کے رخ موڑ گیا۔
''تم کو معلوم ہے؟ تم بہت خوب صورت ہو رئیس خان زادہ'' وہ شرارت سے کندھے کے قریب بولی تو وہ مڑا..... پر اعتماد سا۔
''بناؤ مت جل پری۔ دادا کہتے ہیں کہ میں بہترین جین میوٹیشن ہوں۔ مجھے فرق نہیں پڑتا کہ میں خوب صورت ہوں نہیں ہوں۔ امیر ہوں نہیں ہوں۔ پسندیدہ ہوں، نہیں ہوں۔ میں بس عام سا رئیس خان زادہ ہی ہوں۔''
''پہلی بار مجھے تمہارے دادا کے کسی 'کہنے' پر اعتراض ہے۔''
وہ باہر نکلے تو واقعی شاہ میر، ماہا ادریس کو گھیرے کھڑا تھا۔ ام ہالہ نے بے چارگی سے بدصورت سے خوبرو اور پھر خوب صورت کا درجہ پانے والے کو دیکھا جو اسے گھور رہا تھا۔

☆☆☆

وہ رات بہت خوب صورت سی تھی۔ کرسمس کی مناسبت سے سجا نیویارک، ڈینی کی ماں کی کلاس کے لوگ۔ خالصتاً قانون کی زبان بولتے لوگ۔ ڈینی نے مجھے مہنگا لباس خرید کر دیا تھا۔ سیاہ لبادہ مجھ پر اتنا جچ گیا کہ کئی گردنیں میری اور مڑتیں۔ میں سرخ ہوئی جاتی۔ جب کوئی گھمبیر سا بولا۔
''آج پچیس سال بعد میں نے گالوں کا یہ 'خالص' اناری رنگ دیکھا ہے۔ جان سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟'' ادھیڑ عمر..... بلا کا اسمارٹ شخص

ڈیفی مدد کو لپکا۔

"یہ میرے ساتھ ہیں سر، میں ڈینئل کلارتھ، یہ کیلہ ذیک میری دوست۔"

"کیا یہ ہمیشہ ایسے ہی مسکراتی ہے؟" وہ ڈیفی کو دیکھتا تک نہیں۔

"پاگل ہے کیا؟" وہ گیا تو پھٹ پڑی۔

"پاگل...... بے وقوف جیوئل جسٹس میں دیوتا ہے۔ امریکا کی دنیا میں قانون کی سند سمجھا جاتا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں ہو رہا اس نے تم میں بھلا کیا دیکھ لیا۔" ڈیفی اپنی جون میں لوٹا تو میرا منہ سوج گیا۔

واپسی صبح ساڑھے تین بجے ہوئی۔ سیونتھ اسٹریٹ ایونیو میں اکا دکا گاڑی گزرتی۔ سکون ہمارے ساتھ ساتھ چلتا۔ ہلکی گیلی سڑک پہ اوورکوٹ پہنے ہم دونوں فرصت سے تھے جب ڈیفی نے اپنے فون پر "پرفیکٹ" لگایا اور مجھے ہاتھ بڑھا کے رقص کی دعوت دی۔ میں کھکھلائی۔ پھر اس سکوت کو ترتیب سے اٹھتے پاؤں سے کم کرنے لگی۔ پھر یوں ہوا کہ دھڑکنوں نے اپنا شور کر دیا۔ روشنی، اندھیرا، خاموشی...... سب ناظرین ہو گئے۔ محویت سحر انگیزی اور خوشی ہم میں شمولیت کر گئے۔ 'پرفیکٹ' ختم ہوتے ہی ڈیفی ویران سڑک پر گھٹنے کے بل بیٹھ گیا اور پھولی سانسوں میں بولا۔

"کوئی عورت مجھے یوں عقل سے محروم نہیں کر سکتی کہ میں اس کی ہنسی کے لیے تنہا سڑکوں پر ناچوں۔" میرا ہاتھ تھام لیا۔ جو گرم ہوتا جاتا۔

"ڈینئل کلارتھ کو کیلہ ذک چاہیے ہمیشہ کے لیے صرف اپنے لیے۔"

جیب تھپتھپا کے وہ انگوٹھی نکالتا بولا تھا۔ مجھے [illegible]ب بھی یاد ہے وہ ایسے ہی بولا تھا۔ میں سن کھڑی رہی [illegible]نی خاموشی سے وہ گھبرایا تھا شاید۔

"کچھ تو بولو۔"

"دیکھ لو...... میں خاصی موٹی ہوں۔" میں نے [illegible]ب چڑھا کے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ انگوٹھی لینے [illegible]ں، میں متامل تھی۔ جانے کیوں؟ مگر میں خوش تھی۔

"انگوٹھی مجھے پہناتے وہ ... میری پسند سے مجھے اسٹریٹ لائف ... پول ڈانس کر کے دکھانے لگا۔ میری ... میرے قہقہوں سے خوف زدہ سے تھے ...

"ڈیفی یہ انگوٹھی...... یہ لوسی آنٹی کی ہے۔ ... پنک بیگ۔"

"مجھے لگا۔" یہ تمہاری ممی کی ہے اور تم ... ہو گی۔" وہ محتاط ہوا۔

"میرا بیگ ابھی بھی ہے تمہارے پاس۔" ڈیفی نے سر ہلایا تو میں نہال ہو گئی۔ وہ میرا ... بیٹھا تھا تو میں بڑھاپے سے بے فکر ... ہو جاؤں۔ میں نے ڈیفی کے حق میں فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

اتوار کے دن کی کچھ فرصتیں تھیں اور ہالہ کہہ بیٹھی۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے تمہارے دادا تمہیں معقول رقم بھیجتے ہیں ماہانہ۔ پھر ایسی غربت کیوں کہ تمہیں شاہ میر کی اترن پہننی پڑے۔"

وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کتنی ہی دیر ٹنڈ منڈ درختوں کو پرکھا۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کے ایک سفر پہ نکلا۔

شاہدرہ کی تنگ گلیوں والے گھر میں کہ جس میں ایک کمرہ ہی بیڈ روم، کچن اور باتھ روم تھا، ہالہ ذکریا نے رئیس خان زادہ کو والہانہ تین معذور بچے نما لڑکوں کو چومتے دیکھا۔

مڑی ٹانگوں اور ابھرے سینوں والے وہ لڑکے 'غوں غوں' کرتے اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ بوڑھی ماں دروازے کو لپکی تو رئیس بول اٹھا۔

"اماں! میں پہلے کچھ کھاتا ہوں کیا؟ ہاں ساگ بنا ہے تو لے آئیں گرم کر کے، میں تندور سے روٹیاں لے آتا ہوں۔"

ہالہ بس ٹکر ٹکر دیکھتی۔ پھر وہ اسے ساگ سے روٹی کھاتے اور ان بچوں کو دلیہ کھلاتے دیکھتی رہی۔ واپسی کو مڑے تو خاتون نے دو سو کے دو نوٹ ہالہ کو پکڑا دیے۔ رئیس نے اعتراض کیا تو بولیں۔

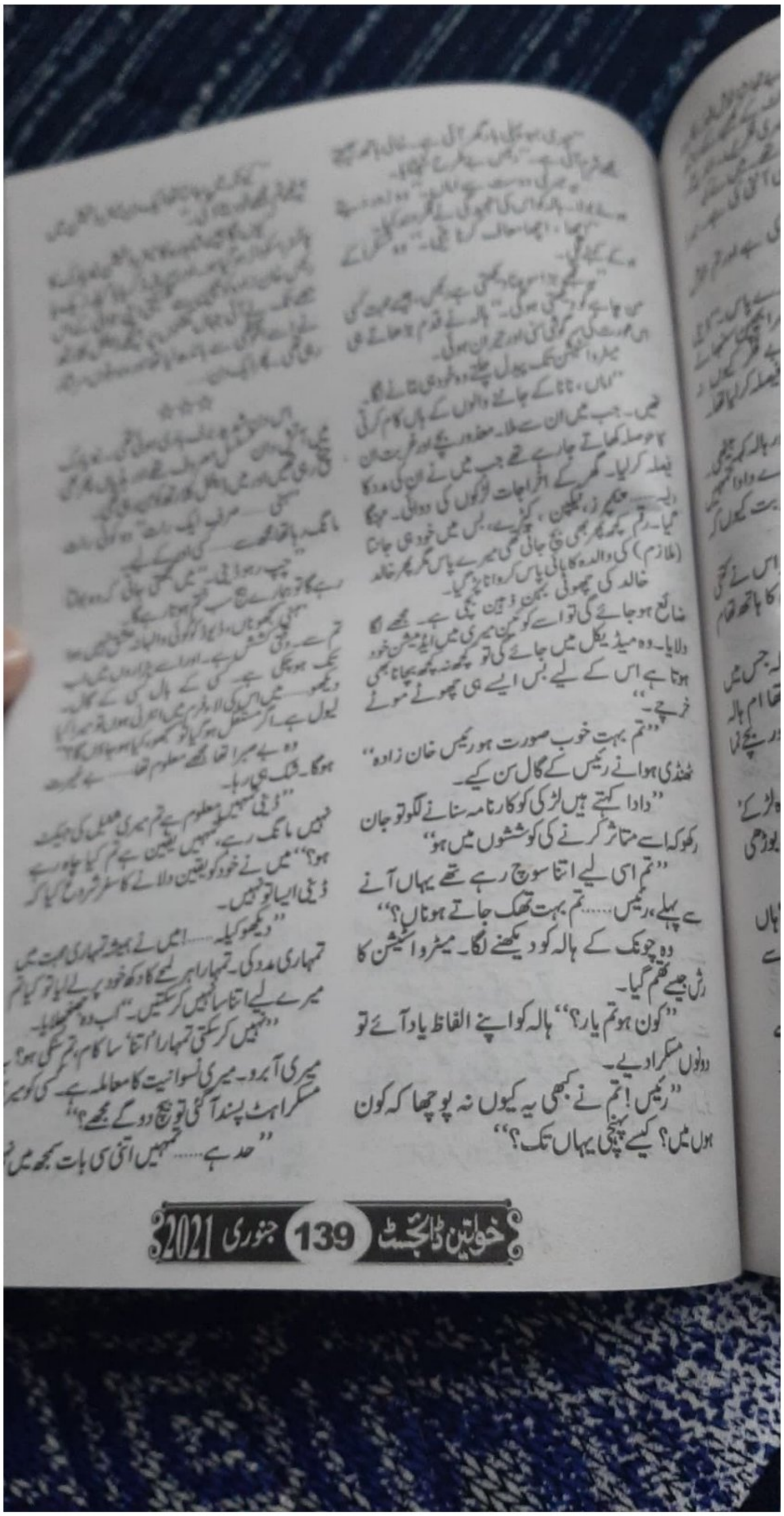

[illegible]

"کہاں، نانا کے جانے والوں کے پاس ..." وہ خود ہی بتانے لگا۔

نہیں۔ جب میں ان سے ملا۔ معذور بچے اور غربت ان کا حوصلہ کھاتے جا رہے تھے جب میں نے ان کی مدد کا فیصلہ کرلیا۔ گھر کے اخراجات لڑکوں کی دوائی۔ ... میڈیسن، کپڑے۔ بس میں خود ہی جانتا تھا۔ رقم کچھ بھی بچ جاتی تھی میرے پاس مگر پھر خالد (ملازم) کی والدہ کا بائی پاس کروانا پڑ گیا۔ خالد کی چھوٹی بہن ذہین بچی ہے۔ مجھے لگا ضائع ہو جائے گی تو اسے کومن میرٹ میں ایڈمیشن دلایا۔ وہ میڈیکل میں جائے گی تو پھر نہ کچھ بچانا بھی ہوتا ہے اس کے لیے بس ایسے ہی چھوٹے موٹے خرچے۔"

"تم بہت خوب صورت ہو رئیس خان زادہ" ٹھنڈی ہوا نے رئیس کے گال سن کیے۔

"دادا کہتے ہیں لڑکی کو کارنامہ سنانے لگو تو جان رکھو کہ اسے متاثر کرنے کی کوششوں میں ہو"

"تم اسی لیے اتنا سوچ رہے تھے یہاں آنے سے پہلے، رئیس...... تم بہت تھک جاتے ہو ناں؟"

وہ چونک کے ہالہ کو دیکھنے لگا۔ میٹرو اسٹیشن کا رش جیسے تھم گیا۔

"کون ہو تم یار؟" ہالہ کو اپنے الفاظ یاد آئے تو دونوں مسکرا دیے۔

"رئیس! تم نے کبھی یہ کیوں نہ پوچھا کہ کون ہوں میں؟ کیسے پہنچی یہاں تک؟"

[illegible]

ہوگا۔ شک ہی رہا۔

"ڈیڈی تمہیں معلوم ہے تم میری عقل کی حیثیت نہیں مانگ رہے، تمہیں یقین ہے تم کیا چاہ رہے ہو؟" میں نے خود کو یقین دلانے کا سفر شروع کیا کہ ڈیڈی ایسا تو نہیں۔

"دیکھو کیلہ...... میں نے ہمیشہ تمہاری محبت میں تمہاری مدد کی۔ تمہارا ہر لمحے کا دکھ خود پہ لیا تو کیا تم میرے لیے اتنا سا نہیں کرسکتیں۔" اب وہ جھنجلایا۔

"نہیں کرسکتی تمہارا 'اتنا' سا کام، تم سمجھ نہیں رہے۔ میری آبرو۔ میری نسوانیت کا معاملہ ہے۔ کسی کو میری مسکراہٹ پسند آگئی تو بیچ دو گے مجھے؟"

"حد ہے...... تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں [illegible]

آرہی۔ رہنا تو مجھے ہی ہے ناں تمہارے ساتھ، تم ادھوری ملو یا مکمل، مجھے منظور ہے۔ اتنا نخرا کس بات کا۔ اپنی ماں کے ساتھ ہوتیں تو یہی کام بلا معاوضہ اسٹیورٹ کے لیے کر رہی ہوتیں اور.....''

اور پھر یوں ہوا کہ میں نے پوری قوت سے ڈینی کے منہ پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا۔

''اور یہ کہ میں یونہی اسٹیورٹ کا منہ توڑ کے آئی تھی اور تمہارا بھی توڑ دوں گی اور ہر کسی کا جس نے مجھ سے میرا واحد فخر چھیننا چاہا۔''

ڈینی سیدھا ہوا اور اگلے لمحے اس نے ایک مردانہ طمانچہ میرے گال پر دیا تھا اور میں اوندھے گری تھی۔ گالیوں کے طوفان نے اس کے دو چار دوستوں کو کمروں سے نکال کے باہر کھڑا کیا تھا۔

ڈینی نے مجھے جیکٹ سے پکڑ کے گھسیٹا اور دروازے سے باہر نکال دیا۔

''اب میں دیکھتا ہوں میرے بغیر تم کیسے سروائیو کرو گی۔ انتظار کروں گا کہ جب تم اسی دروازے پر خود کو آگے پیش کرو گی۔''

''کیا یہ وہی ڈینی تھا جو میرے لیے سڑکوں پر ناچتا پھرتا تھا۔ مجھے ہلٹن میں ناشتا کرواتا۔ میرے ساتھ سڑکوں پر نوکری کے لیے دھکے کھاتا۔ کیا واقعی' محفوظ مستقبل' دنیا میں وہ بلا بن چکا جو ہر رشتے۔ ہر جذبے کو کھا گئی۔

آئندہ آنے والے پانچ گھنٹوں نے مجھ سے میرے بیس سالوں کا ہر بنا بنایا راستہ چھین لیا۔ ان پانچ گھنٹوں نے میرے اردگرد دیواریں کھینچ دیں۔ آسمان کو چھوتی۔ زمین کو محدود اور مسدود کرتی دیواریں۔

پہلے گھنٹے میں مجھے نوکری سے برخاستگی کا فون موصول ہوا۔ تب میں شدید ٹھنڈ میں اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں بینچ پر بیٹھی ابھی کچھ سوچ بھی نہ پائی تھی۔

اسی فون کال نے میری عزت نفس کو گھٹنوں کے بل گرا دیا۔ میرا پلیز پلیز کہنا اور مخاطب کا برائے نام اطلاع دے کر فون بند کر دینا۔ پھر میری روم میٹ کا فون آیا کہ اپنا سامان اٹھالوں اپارٹمنٹ سے، پہلے گھنٹے میں، میں بے بس ہو گئی۔

دوسرا گھنٹہ شروع ہوا تو میرا دماغ بھی کچھ شروع ہوا۔ میں نے اس دن پہلا فون روحی کو کیا تھا۔ اس نے فون اٹھایا ہی نہ گیا۔ یونیورسٹی کے کچھ اور دوست۔ مجھے لگا ساری دنیا سو گئی ہے یا میں کسی اور سیارے سے ماضی کا سفر کر آئی ہوں۔ جب دوسرا گھنٹہ ختم ہونے کو تھا تو میں نے اپنی ماں کو فون ملایا تھا۔

''ممی! مجھے گھر آنا ہے۔'' میری ماں نے شاید اس ٹھنڈ کا تصور بھی نہ کیا ہوگا جو میری آواز میں تھی۔

''بے بی..... تم کہاں ہو؟'' ہچکچاہٹ کو میں نے بھانپ ہی لیا۔

''ممی پلیز۔'' میں بالآخر رو ہی دی۔

''بے بی..... اسٹیورٹ وہ گھر پر ہی ہے۔ اس دن تم نے اسے مارا نہ ہوتا تو.....''

''خدا کے لیے ممی..... کبھی میری ماں بھی بن جایا کریں۔'' میں چلائی۔

''یا تو میں سردی سے اکڑ کے مر جاؤں گی یا گینگ ریپ سے اور آپ بیٹھی رہیے گا اسٹیورٹ کا گھٹنا سہلاتی۔''

''میں تمہیں ذیک کا نمبر دیتی ہوں۔'' میں سن ہو گئی۔

کیا یہ واقعی میری ماں ہے؟ مجھے شک نہیں یقین ہوا کہ یہ میری ماں نہیں ہو سکتیں۔

''وہ مجھے چھوڑ چکے ہیں..... آپ نے مجھے چھوڑ دیا۔ ممی۔ بائے۔''

آنسو کبھی سرد جھیلوں سے جم جاتے۔ تو کبھی گرم سمندروں سے لہریں بناتے۔ یوں تین گھنٹے گزرے اور چوتھے گھنٹے میں جب میرے ہاتھ نیلے ہو گئے ایک فون کال آئی۔

''میرے زندگی کے تجربے نے یہ بات میرے کان میں ڈالی ہے کہ عورت جتنی حسین ہوگی۔ اتنی بے وقوف بھی ہوگی۔ مگر اتنی حسین عورت کو اتنا نڈر..... میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

بھاری مردانہ آواز..... ڈیوڈ ہالینڈ..... ایک اور

لیوا تھن۔

"اگر وہ لڑکا مجھے وقت نہ دیتا تو میں اسے باوقار انداز سمجھتا۔ مگر اب تو تم نے 'فخر' کو درمیان میں لاکر میری 'عزت' کی جان پر بنادی ہے۔ مجھے یقین ہے تم سمجھ جاؤ گی کہ تم بہت بری طرح پھنس چکی ہو۔ میرا ڈرائیور تم سے کچھ ہی دور منتظر ہے۔ آجاؤ تمہیں یورپ کا ٹرپ لگادوں گا۔"

"اور میں تمہیں پھانسی لگوادوں گی مانسٹر، میرا فون ریکارڈنگ پر ہے۔ عیش کے چکروں میں عزت اور عہدہ بھی جائیں گے۔ میں نڈر ہوں ناں۔" میں جانتی تھی ڈر کو میری کپکپاہٹوں کی خبر ہوچکی۔ وہ بے طرح ہنسا۔

"پور چائلڈ بے بی میرا ڈرائیور کیا صرف گاڑی ڈرائیور کرتا ہوگا؟ تمہارا فون تو بحرالکاہل سے بھی ڈھونڈ لیا جائے تو میرے خلاف کچھ نہ ملے۔ ہاں ایک اچھی آڈیو ٹیپ میں اگلے آدھے گھنٹے میں نکلوا سکتا ہوں۔ تمہارے خلاف اور کیا یہ میرا ہی نمبر ہے؟ جس سے بات ہورہی ہے اور تمہارے اپارٹمنٹ کی لڑکیاں کیا کرتی تھیں بھلا؟ کون مانے گا کہ تم بھی ان میں سے نہ تھیں۔ اور آخری بات سارے قانونی اور سیاسی پنڈت میرے ساتھ شام کی چائے پر یہ حماقت چسکیاں لے کر ڈسکس کریں گے اور مجھے تھپکی دے کر جائیں گے۔"

چوتھے گھنٹے کے ختم ہونے تک اس مرد نے ساری امیدیں بھی ختم کردیں۔ کیا یہ واقعی ترقی کا عروج سمجھی جانے والی صدی تھی؟ مجھے شک نہیں یقین ہوا کہ انسان جتنا بھی۔ 'معاشرتی' ہوجائے وہ رہے گا۔ 'حیوان' ہی۔

اب یہ تھا کہ ڈیوڈ کے لوگ آس پاس ہی تھے۔ حکم کے منتظر، کوئی راہ نہ تھی۔ میں نے ہانپتے ہوئے اپنے باپ کو فون ملایا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ لوسی آنٹی کی انگوٹھی سے ابا قیمتی ہوتے ہیں۔ تو میں اس رات ابا چرالیتی۔ کاش مجھے کبھی اسٹیورٹ نہ ملتا۔ نہ وہ نہ لڑکے..... نہ ڈینی..... نہ ڈیوڈ۔

اندھیرا..... تنہائی..... خوف..... سردی..... میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈیڈی کو چوتھی کال ملائی۔ ڈیوڈ کے آدمی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے سیدھے ہوئے۔ مجھے سڑک پار کرنا تھی اور گاڑی میں جا بیٹھنا تھا۔ اور بس۔

ڈیڈی کو بیل جارہی تھی۔ اور بالآخر انہوں نے اٹھا ہی لیا۔

"ڈیڈی....." میں سڑک کے بیچ کھڑی ہوگئی۔ ایک تیز رفتار ٹرک میری طرف آیا۔

"ہالہ..... یہ تم ہو؟ ہالہ"..... ڈیڈی وارفتہ سے بولے۔

"ڈیڈی..... اب تو مدد کی ضرورت بھی نہیں رہی۔" ٹرک نے میری آواز بھی۔ روندھ دی۔

آنکھ کھلی تو ڈیڈی تھے۔ روتے، نادم، ممی تھیں شرمندہ۔ مگر میں وہ ہالہ تھی نہ کیلہ۔

ڈیڈی مجھے لے گئے۔ سائیکاٹرسٹ..... سائیکالوجسٹ کے پاس بھی۔ اور پھر ذکریا جنجوعہ کی بیٹی پاکستان بھیج دی گئی۔

اور یہاں مل گیا ایک مسیحا، جو کہتا..... 'میں تم ہوں۔"

وہ مسکرائی..... رئیس سے یہ بھی نہ ہوسکا۔ رکا ہوا لمحہ..... رواں ہوگیا۔ "مجھے اکھاڑ گیا..... پھر لگایا نہیں گیا۔ یوں ہوا جیسے کسی نے ڈونٹ پر حلیم ڈال دیا ہو۔ یا کڑاہی میں قورمہ اور اس میں فالودہ۔ جیسے جرابیں ہاتھوں پر چڑھالی ہوں اور....."

اور وہ ہنسنے لگی رئیس مسکرا بھی نہ سکا۔

"ارے میری زندگی میں آنے والے پہلے خوب صورت مرد! اب میں بہت آسودہ..... اور کچھ کچھ خوش بھی ہوں۔"

وہ آنکھ دبا کے بولی۔ وہ کالونی کے بلاکس میں چلتے گئے۔ ہالہ نے سرخ پھولوں سے نرم بال گردن سے اٹھائے اور رئیس کے برابر سے نکل کر سامنے آگئی۔ گردن پچھلی طرف سے آدھی اگلے حصے سے کٹی پھٹی تھی۔ یوں جیسے کسی نے گوشت کا قیمہ وہاں بھرا ہو

اور گہری لکیریں چھوڑ دی ہوں۔ رئیس کے چہرے کا رنگ معمول پہ نہ رہا۔

''میرا پورا جسم بھرا ہے ایسے ہی قسمے نما گوشت سے۔'' وہ شاید مسکرانا چاہتی تھی۔ بات مکمل کرنا چاہتی تھی۔

''اور میں کبھی فیملی نہیں بنا سکتی...... میں ماں ہی نہیں بن سکتی۔''

''اور...... یہ کہ مجھے بچپن سے جو بنتا تھا...... وہ 'فیملی والی' ہی بنتا تھا مجھے 'گھر' ہی تو کھینچتا رہا۔ یہاں سے وہاں۔'' اب رئیس نے اپنا بازو اس کے کندھوں پر پھیلایا اور بس......

وہ سڑک پر چلتے جاتے اور اندھیرا گہرا ہوتا ان کے پیچھے پیچھے آتا جاتا جیسے ان کو جھپٹ لے گا...... اور پھر اس نے جھپٹ ہی لیا۔

☆☆☆

رئیس خان زادہ کو یکلخت ہی یہ لگنے لگا تھا کہ اس کی حس مزاح خاصی برق رفتار ہو گئی ہے۔ یہ دو جاڑوں بعد کی بات ہے۔

انتیس سالہ رئیس کو بالآخر ایک غیر سرکاری کالج میں لیکچرار کے طور پر تقرری کا اعزاز ملا تھا۔ مگر وہ تھکن زدہ لگتا۔ پارک کا ایک مخصوص گوشہ اب جیسے روزانہ ان کا منتظر رہتا یا پھر مسز کرنل کا لان یا سمیعہ آنٹی کا کچن۔

تب وہ پارک میں بیٹھے تھے درختوں پر ہریالی آنے میں ابھی دو ہفتے اور لگنے تھے۔

''جانتی ہو پرنسپل نے مجھ سے کیا کہا ہے؟ کہا کہ مستقل استاد چھٹی پر ہے اس لیے میری ضرورت ہے۔ وہ مستقل استاد اس دن میرے لیے ہی حاضر ہوئے تھے۔ بولے۔

عرفان صاحب اپنی سیلری میں سے دس ہزار آپ کو دیں گے۔ اور پانچ کالج فنڈ سے ملے گا۔ رئیس صاحب! آپ کو عرفان صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ اتنی رقم سے ہماری مدد کر رہے ہیں۔ ہالہ مجھے پہلی بار لگا کہ میں حق دار نہیں مستحق ہوں اور جہاں مجھے ایسا محسوس لگنے لگے میں تھک جاتا ہوں۔ میں عرفان صاحب

کی مدد کو وہاں بلایا گیا تھا یا...... مجھے کبھی رویوں کی سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔ میں آخر کیا کر رہا ہوں؟ مجھے آخر کرنا کیا ہے؟ میرے ساتھی کب کے سیٹل ہو چکے اور میں......

ہالہ نے اس کا کندھا تھپکا۔

''ہو سکتا ہے...... راہ کوئی اور ہو...... منزل کہیں اور سے ملنی ہو۔ چلنا تو مت چھوڑو۔'' وہ گھبرا کے اٹھ گیا۔

پھر کئی دن بعد وہ ہنستے ہنستے ہالہ کو بتانے لگا......

تب وہ ڈنر بنا رہا تھا اور ہالہ پاس کھڑی تھی۔

''تم تیار رہنا اگلے ہفتے دادا آرہے ہیں ملتان۔ لاہور آئیں گے تو ملوانے لے جاؤں گا۔''

ہالہ نے پلیٹ منہ کے آگے کر لی۔

''کیا کر رہی ہو؟''

''شرما رہی ہوں۔'' وہ ہنسا۔

''خوش فہمی اس پلیٹ جیسی ہو گی ناں؟''

دونوں مسکرائے اور دادا نے وہ کہہ دیا جو رئیس خان زادہ ہالہ سے کبھی نہ کہہ پاتا۔

☆☆☆

وہ شیخوپورہ سے ذرا ہی دور ایک فارم ہاؤس تھا امارت چھلکاتی عمارت...... باوقار اور رعب دار دادا......

وہ سبز مشرقی لباس میں تھی۔ گھڑی گھڑی بال سنوارتی۔

''تمہاری گردن کا زخم کافی ہولناک دکھتا ہے'' دادا شروع ہوئے۔ رئیس کہیں باہر ملازمین میں تھا۔

''مگر افسوس کہ یہ کریہہ زخم بھی تمہیں کچھ نہ سکھا سکا۔''

وہ زرد پڑنا شروع ہوئی۔

''تم آج بھی نڈر اور بے قوف ہی ہو۔ خوب صورت بھی ہو اور ٹرک کے سامنے بھی کھڑی ہو روندے جانے کے بعد تو تمہیں خود سے اٹھنا سیکھ جانا چاہیے تھا مگر تم نے رئیس کی شکل میں ایک اور ڈھال ڈھونڈ لیا میری بیٹی! جو تمہارے منہ میں لقمے ڈالتا، روتی کو بہلاتا۔ چیختی کو گلے لگاتا اب لگتا ہے۔

''مگر کبھی یہ سوچا کہ کل کو وہ لڑکی ماہا آئے گی رئیس کہاں ہو گا؟ اگر رئیس نہ ہوا تو تم کہاں ہو گی؟''

نے اپنے پر کھولنے تک نہیں سیکھے۔ اڑو گی کیسے؟"
وہ سفاک نہ تھے۔ لگ رہے تھے وہ ہولے ہولے صفر کی جانب دھکیلی گئی۔

"میرا پوتا تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا ام ہالہ! کر ہی نہیں سکتا۔ وہ بہترین جین میوٹیشن ہے۔ ماہا سے بے وفائی...... وہ مر ہی تو جائے گا۔ کر بھی لے تو فیملی والا، ہونا تو اس کا خواب ہے۔ بے گھر، بچوں کا خواب تمہیں تو اچھی طرح علم ہو گا۔ اڑنا سیکھ لو میری بچی۔ اس سے زیادہ بے وقوفی کے بعد تمہیں کوئی 'مسیحا' بھی نہ ملے گا۔" وہ 'علم والے' دادا سے اتنا ڈری جتنا موذی مرض والا ہر رات موت سے ڈرتا ہو گا۔

پھر وہ بول نہ سکی...... ہل نہ سکی...... بال سنوارنا تو دور......

"ماہا اور شاہ میر پچھلے چار ماہ سے ایک دوسرے کو ڈیٹ کر رہے ہیں۔"

واپسی میں وہ اتنا سرد ہوئی کہ رئیس برف کا مجسمہ ہو گیا۔

"یہ کیسا مذاق ہے؟" کتنی ہی دیر بعد اس کے منہ سے برف اڑ پائی۔

"تمہیں اس کے ہاتھ میں ڈھائی لاکھ کا فون نظر نہیں آیا کبھی۔ یا وہ فون شاہ میر کے ہاتھ میں نظر نہیں آیا پہلے کبھی؟"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی۔ رئیس کا درد کیسے دیکھتی۔

"تمہیں یوں نہیں کہنا چاہیے۔" وہ کھائیوں جیسے لہجے میں بولا۔

"تمہارے دادا کو بھی یوں نہیں کہنا چاہیے۔" دل چیخا۔

گھر آنے تک بہت کچھ ڈھے چکا تھا۔ جوان دونوں میں تھا۔

☆☆☆

"میں نے رات تین بجے تمہیں کال کی تھی کہاں مصروف تھیں؟" اس نے اکڑے کندھوں سے پوچھا تو ماہا ادریس حیران ہوئی۔

"وہ...... میں میں، کیوں کی تھی کال؟" تیوری چڑھ ہی گئی۔

"یہ فون کب لیا تم نے بتایا ہی نہیں۔" اس نے اسی انداز میں پوچھا۔

"کیا ہو گیا رئیس؟ جان کو کیوں آ جاتے ہو۔ کیا سننا چاہتے ہو؟"

"صرف سچ...... کیسا ہی ہو...... مگر سچ ہو۔" وہ اعتماد سے کہانی بننے لگی۔

"ہاں تو دنیا کے اکلوتے سچے شخص یہ فون مجھے شاہ میر نے دیا ہے اور میں مصروف بھی اس کے ساتھ تھی، پوچھو گے کیوں؟"

"نہیں۔" یک حرفی جواب۔ ماہا ادریس کی کہانی کو جھٹک کر ایک طمانچہ سا اسے مارا۔

وہ اپنی جیکٹ سنبھالتا اٹھا۔

"سچ بولنے کا شکریہ...... احسان مند رہوں گا۔"

ماہا حیران ہوئی۔ تڑخ گئی۔

"ہونہہ...... واقعی احسان ہی ہوا۔ ام ہالہ سا مغربی جادو ہم نے ہی سونپ دیا تمہیں۔"

وہ چلا ہی گیا۔ اور وہ جو بالکونی میں کھڑی ام ہالہ کو دہلا گئی۔ تھکن زدہ نہیں۔ شکست زدہ لگا۔

"کتنے سالوں کا رشتہ...... رئیس جیسا ہیرا۔ لڑکی تم نے کیا کبھی سوچا بھی ہے؟" وہ ماہا سے لڑ گئی۔

"اتنے سالوں سے سوچ ہی تو رہی تھی۔ کیا کروں گی رئیس کی مزیدار ہانڈیوں کا میں۔ تو اتنے سال شاہ میر کو ہی سوچا ہے میں نے۔"

"شاہ میر کی سوچ کا بھی سوچا ہے کبھی؟" وہ آسانی پسند نہیں رئیس جیسا۔ نہ ہی مستقل مزاج۔"

وہ پلٹ آئی۔ اس عہد کے ساتھ کہ وہ ماہا ادریس کو لوٹا دے گی رئیس خان زادہ کی طرف۔

☆☆☆

بہار لاہور کو روشن کر رہی تھی اور چند روز اور کیا ہے احسان مند، سا رئیس خان زادہ روز کھانوں کی تراکیب بھول کر کوئی غلطی کر بیٹھتا۔ بالکونیوں، چھتوں پر ٹہلنا چھوٹ گیا۔ ہنسی پیچھے رہ گئی۔ خالہ کی بہن کی سسٹر فیس بھی رہ گئی۔

بالآخر پندرہ ہزار والی۔ 'باعزت' نوکری بھی گئی۔
وہ زیرو سے منفی زیرو ہو کر ناشتے، لنچ، ڈنر بناتا کھلاتا اور سو جاتا۔ نہیں شاید آنکھیں بند کر لینا نیند تو نہ ہوئی۔

دادا ملتان وہاڑی زمینوں پر روانہ ہو گئے اور ادھر عکاشہ کراچی سے لوٹ آئی۔ زرد، فربہ اور ست، رئیس حتیٰ الامکان اس کا خیال رکھنے لگا مگر وہ بے زار انسان تھی۔

رات کے جانے کون سے پہر رئیس نے حملہ کرتی فوجوں سا شور سنا اور چوکنا ہوا۔ سمیعہ آنٹی کا چیخنا..... شاہ میر کا دھاڑنا۔ نانا کی للکاریں اور ماموں کی خاموشی۔ وہ بستر پر لوٹ آیا۔ جہاں ایک نوعمر وجود خاکی وردی پہنے بیٹھا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے مجھے زبردستی گھریلو معاملات میں دخل دینا پسند نہیں۔" رئیس لیٹتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"تو بالآخر ڈھائی سال بعد میں محترم ہو ہی گیا کہ تمہیں نظر بھی آ گیا۔" رئیس سر جھٹک کے رہ گیا۔

"ہالہ گئی تو ضرورت پڑ گئی میری؟"

"صرف ہالہ ہی نہیں..... اس بار تو ہمت بھی چلی گئی یار۔"

جانتے ہو..... ہماری ہمت کون ہوتا ہے؟ پہلا خواب..... پہلا رشتہ..... پہلا دوست اور پہلا قدم" وہ رکا رہا کافی دیر۔

"تم میرا پہلا خواب تھے یار..... کمیشن کا خواب، فوجی افسر بن کے مسافر ہونے کا خواب۔ مگر میں اپنے سخت جان ہاتھوں کی انگلیاں سیدھی نہ پیش کر پایا اور میڈیکل نے تمہیں مجھ سے چھین لیا۔ مگر تم ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ تھپکی دیتے رہے۔ ہر کسی کا پہلا خواب ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ اب تو سب چھوٹ گیا۔ خواب، رشتہ، دوستی، ہاں قدم رک ہی نہیں رہے۔"

وہ مضطرب سا لیٹا رہا۔ بالکونی میں جاتا تو ہالہ کا گھر نظر آتا۔ کسی کھڑکی، چھت پر وہ نظر آتی تو اس کی شکست پڑھ لیتی۔ آوازیں آتی رہیں اور رات آگے بڑھتی رہی۔

☆☆☆

شاہ میر آج کل گھر پر نظر ہی نہ آتا۔ پہلے گھر میں عجب وحشت ناچتی پھرتی۔ اذہان پر کھلا یا سا کبھی اس کمرے میں جاتا کبھی اس، سمیعہ آنٹی نے عکاشہ کے کمرے میں جانے سے سب کو منع کر دیا۔ مگر اس کی دوائیوں کی تھیلیاں اور ڈاکٹر کے چکر بتاتے کہ وہ بیمار ہے۔ دن اتنے بے رونق کبھی نہ تھے اور راتیں اتنی طویل۔

ہالہ کبھی اسے تلاشتی ادھر آتی تو جیسے زیادہ دیر رک نہ پاتی۔ وہ مسز کرنل کے ہاں جاتا تو بے دلی سے اٹھ آتا وہ یہ ماننا ہی نہ چاہتا کہ اگر ماہا کا شاہ میر میں دلچسپی لینا غلط تھا تو غیر شعوری طور پر وہ ماہا کو کب کا چھوڑ کر ہالہ کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

وہ سبزیاں خرید کے گھر لوٹا تھا۔ ٹیکسی کو کرایہ تھما کے مڑا تو ماہا سرخ چہرہ لیے ـــــ کھڑی تھی۔

"کبھی غور سے دیکھا ہے تم نے خود کو؟ کیا ہو تم؟" رئیس بس خاموش رہا۔

"نہ خاندان، نہ گھر، نہ شکل، نہ بہترین مستقبل، کیا کرتی میں؟"

"تم نے جو کیا، بہترین کیا۔" وہ بول پڑا۔ ایک طرف سے گزرنے لگا۔

"میرے بہترین کو تم نے اپنے بدترین سے بدل لیا۔ تم اتنا کینہ چھپائے پھرتے ہو اور کہلاتے ہو سادھو۔ خود سے کچھ نہ ہو سکا تو تم نے یوں بزدلوں کی طرح انتقام لیا مجھ سے۔ تم نے اپنی دوست کو ہی چارہ بنا لیا میرے خلاف۔ تف ہے ہم سب پر جو تم کو فرشتہ سمجھتے رہے۔ تم نے حد ہی کر دی رئیس۔ وہ لڑکی میرے منہ پر کہہ گئی ہے کہ وہ شاہ میر کے ساتھ اس لیے ہے تاکہ میں تمہارے ساتھ ہو سکوں۔ اللہ تمہیں برباد کرے رئیس! تم نے یہ کیا کر دیا۔ میں نے کیا نہ کیا تھا شاہ میر کے لیے۔"

رئیس رکتا تو مر جاتا۔ گھر میں داخل ہوا تو جیسے کہانی کا انت ہی ہو گیا۔

تماشا لگا ہوا تھا۔ سارے کردار جمع تھے۔ سمیعہ آنٹی گرجیں۔

"اس کا کارنامہ دیکھیں اور اکڑ دیکھیں۔"

رئیس سبزیاں کچن میں رکھنے لگا اور معاملہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ سمیعہ آنٹی بولیں۔

"یہ دو ہفتے تو چھپالیا ہم نے۔ مزید دو ہفتے گزرے تو ہم اپنا منہ چھپاتے پھریں گے۔ بہت ہو گیا اب بس۔ انکل! آپ بات کریں ظفر صاحب سے۔ اسی ہفتے چھوٹی سی تقریب رکھ لیتے ہیں۔ رئیس اپنا ہی بچہ ہے اور کیا......"

رئیس ٹھٹک کے آگے بڑھا۔ اب وہ منظر میں تھا۔ عکاشہ نے ہتک سے دیکھا۔

"ممی! خدا کے لیے بند کریں یہ میلوڈراما۔ آپ کو سارے جہاں میں صرف یہ ناکارہ انسان ہی ملا ہے میرے لیے۔ میری طرف سے آج بھی نہ ہے اور ہر آنے والے کل میں بھی نہ ہی ہو گی۔"

رئیس کو بہت کچھ ایک ساتھ سمجھ میں آیا اور باقی بات نانا نے مکمل کر دی۔

"یہ بھی خوب کہی تم نے بے حیا۔ یہ جو جسٹ انجوائمنٹ لیے گھوم رہی ہو، اس کو کس کا نام دو گی؟ کیا ہم سے یہ امید رکھتی ہو کہ ہم اس گناہ کو پالیں گے۔"

اس بات پر جہاں سب کی نظریں جھکی تھیں وہیں رئیس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

"دادا ابا! آپ ظفر انکل کو اطلاع دیں بس۔ اس کو لائن پر کیسے لانا ہے مجھ پر چھوڑ دیں۔" شاہ میر بولا۔ سارے فیصلے ہو رہے تھے اور وہ کہیں نہ تھا۔ وہ گونگا ہی تو ہو گیا، اپاہج بھی۔

"مما! مجھ سے غلطی ضرور ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں آپ لوگ اس عورت کے پلے باندھ دیں مجھے۔ خدارا کوئی مرد تو ڈھونڈا ہوتا۔" رئیس کا بہترین جین میوٹیشن والا ماسک تڑخ ہی گیا۔

"ایکسکیوزمی۔ آپ لوگ اپنی ہی غلط بیٹی کے غلط کام اور غلط فیصلے کے لیے مجھے کیوں بے عزت کروا رہے ہیں؟" وہ اتنا تو گرج کے بولا ہی کہ سب کو یک لخت چپ لگی۔

"اور تم......" وہ عکاشہ کی طرف مڑا۔ "تمہیں تو شرم سے گونگی ہو جانا چاہیے اگر مر نہیں سکتیں تو...... تم لگیں فیصلے کرنے۔"

وہ یقیناً رئیس نہ تھا۔ مضبوط دلائل...... اونچی آواز، اٹھے کندھے۔ کوئی پہاڑ بھی ہوتا تو وہ ریزہ کر دیتا۔

"تمہیں یقین کیا شک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ مجھ جیسا کورا اور کھرا شخص چار منٹ بھی "تم جیسوں" کے گرد کھڑا ہو سکتا ہے۔" وہ انسان ہی تھا۔ آج سب کو یقین ہوا مگر سمیعہ آنٹی بلبلائیں۔

"یہ تم کیا کہتے ہو لڑکے! یہ لہجہ...... یہ الفاظ۔ تمہیں ذرا لحاظ نہیں کہ اس گھر اور گھر والوں نے کیا نہیں دیا تمہیں۔ ساری زندگی کا لگا ڈالا حساب......"

"رہنے دیں مما!" شاہ میر سے چپ نہیں رہا گیا۔

"اسے اگر ابھی بھی کسی سے امید ہے تو یہ کہاں سنے گا کسی کی۔ دیکھ لے یہ بھی پر پھڑپھڑا کر۔ کچھ نہیں ہو گا اس کا۔"

شاہ میر کی آنکھوں نے اسے چیلنج کیا۔ اتنے دنوں...... کہنا چاہیے سالوں کی تھکان تھی، اب اعصاب چٹخ ہی گئے۔

"اچھا...... تو تم دکھاؤ وہ سرخاب جن سے تمہیں کامیابی کی امیدیں ہیں؟" وہ شاہ میر کے سامنے تن گیا۔ "کیا کمی ہے مجھ میں؟ اگر میں اڑا نہیں تو مطلب یہ نہیں کہ بے پر ہوں بلکہ ایک غلط تھیوری تھی جس نے پر باندھ دیے۔ اور سمیعہ آنٹی! کیا دیا مجھے اس گھر اور گھر والوں نے؟ بتاؤں...... لگاؤں حساب......" وہ ہسٹریائی ہوا۔

"اس گھر نے مجھے محرومیاں، طعنے، ذلت، تنہائی اور تاریک مستقبل کے علاوہ صرف ایک اسٹور کا پلنگ ہی دیا ہے اور میں نے...... میں نے اس گھر کو مالی، چوکیدار، ٹیلر، شوفر، کک اور منیجر دیا ہے۔ ان چھ عہدوں کی ماہانہ تنخواہ کم از کم دس ہزار بھی ہو تو مہینہ ساٹھ ہزار کے مقروض ہیں آپ لوگ میرے۔ پچھلے بیس سال کی تنخواہ کے بنے ایک کروڑ چھبیس لاکھ اسی ہزار۔ رہائش کا

چھتیس لاکھ رکھ بھی لیں تو ایک کروڑ کے مقروض ہیں میرے آپ لوگ۔ مجھے...... میری شخصیت کو تباہ کر دیا۔ میری انگلیاں کھانوں میں چمچ چلاتے ٹیڑھی ہوگئیں۔ مجھے فوج میں کمیشن نہ مل سکا۔ اتنی وفاداری اتنا جوکھم...... اتنی ریاضتیں...... رہا تو میں وہی ملحد نسل......

مجھے کچھ پسند آ گیا تو شاہ میر کا...... کچھ کو میں پسند آ گیا تو شاہ میر کا...... اور بالآخر پالنے کا احسان اور بدلا بھی کیسا اس لڑکی جیسا...... جس کی غلطی میرے ظرف سے بڑی ہرگز نہ تھی مگر جس کا غرور میری پہنچ سے بہت دور ہے۔ ہو گیا سب کا...... مجھے معاف کیجیے گا مگر مجھے بھی انسان سمجھنا شروع کر دیں۔"

وہ سانس لینے کو پچھلے صحن میں پہنچا۔ غصہ...... بے وقعتی...... کم مائیگی...... وہ ہانپتا رہا۔

"نازیہ رزاق کہتی ہے کہ محبت میں تغافل جنم لے لے تو تعلق بھی لاتعلقی کو آوازیں دینے لگتا ہے۔"

ہالہ کی آواز پر وہ پلٹا۔ "تو آج سب معاملات برابر کر ہی دے۔"

"محبت سانس لے تو ہی تغافل جنم لیتا ہے، یہ نہیں جانتی تمہاری نازیہ رزاق۔" وہ بھڑکا۔

"میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی کسی سے۔ تم نے...... ہالہ نے میرے دو رشتوں کو بھیک بنا دیا میرے لیے۔ آخر سب کو میری زندگی میں خود ہی سب کچھ کرنے کی کیا پڑی ہے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی شاہ میر سے تعلقات بنانے کی ام ہالہ! یہ تمہارا مغرب نہیں ہے اسے اس سے توڑا...... اس سے جوڑا۔ اس سے واپسی پھر اس کی طرف......"

"رئیس......" ہالہ کو یقین نہ آیا کہ رئیس اسے ماضی کا طعنہ بھی دے سکتا ہے۔

"مجھے بخش دو ہالہ! نہیں چاہتا میں تمہیں، نہ ہی اس ماہا کو۔ کچھ نہیں چاہیے مجھے سوائے سکون کے۔"

وہ چلانا بند ہوا تو بولی۔

"تم جانتے تھے، تمہارے دادا غلط کہتے ہیں۔ بہترین جین میوٹیشن کچھ نہیں ہوتی۔ جین میوٹیشن ہے ہی ک غلطی کا نام۔ تم غلطی ہو رئیس...... ہم سب کی......"

وہ روتی ہوئی پلٹی تھی۔ رئیس نے سپنے اس کے پیروں سے لپٹتے خود دیکھے اور سب کچھ اس بہترین بنتے عام سے انسان نے خود ہی ختم کر دیا۔

☆☆☆

"آپ مجھے غلط سکھاتے رہے دادا!" وہ روتا تھا بے تحاشا۔

"آپ مجھے فرشتہ بناتے رہے اور میں نہ تھا۔ آپ نے مجھے سچ بولنا سکھایا اور بچوں کی طرح ڈٹ جانے سے منع کیا۔ آپ میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ دیکھتے رہے اور اونچی سے اونچی عمارت بناتے رہے میری۔ سمجھوتا، نقش گری...... اور تھکن یہ کون سا سبق پڑھاتے رہے آپ مجھے۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا تھا مگر آپ کی تھیوری...... زرافہ بن جاؤ۔ تضحیک سہو۔ چپ رہو۔ مجھے ماہا سے لگاؤ تھا، ہالہ سے محبت...... آپ نے یہ سکھا دیا بے وفا ہونا میرے جیسا مرتد ہونا ہے۔ میں ڈر گیا دادا! کاش آپ مجھے متاثر کرنے کے حربے نہ سکھاتے مگر عام انسان سا ترقی پسند ہونا سکھا دیتے۔ آپ مجھے بتا دیتے کہ ماہا ادریس مجھے چھوڑنے کے لیے ہی میرے ساتھ بندھی تھی۔ آپ مجھے زہریلی امیدوں سے بھی واقف کرا دیتے۔ آپ مجھے بتا دیتے کہ صبر کے ساتھ ظرف کی وسعت کی بھی شرط ہے۔ جو آپ نہ ہو سکے۔ میرا باپ نہ ہو سکا۔ وہ مجھ میں کیسے ہوتا؟ دیکھیں، اب میں کیا ہو گیا ہوں۔ میں انتیس سال کا کھردرے چہرے اور تاریک مستقبل والا مرد بن گیا ہوں۔ جو اتنا احسان فراموش ہے کہ سسکتے ہوئے کو گلے لگانے والے ماموں کو حساب کتاب بتا کے انہیں اپنا مقروض کر آیا ہوں۔

وہ ماہا ادریس کہ جس کے پیچھے میرے بہترین چھ سال گئے، آج اسے خود کی نفرت میں مبتلا کر آیا ہوں۔ وہ ام ہالہ کہ جو میں خود تھا...... اس کے لیے میں خود کو غلطی کر آیا ہوں۔ اپنی پندرہ ہزار کی اوقات کو صفر ہی کر آیا ہوں۔ دادا دیکھیں میں جیتے جیتے مر آیا ہوں۔ آپ مجھے اپنی تھیوری کا مفروضہ نہ بناتے، آپ مجھے زرافہ نہ بناتے...... خود سے لگا کے رکھتے مگر

میں خود آپ کے پاس گیا تھا تو...... میرا ماضی ٹھوکر تھا۔ حال بے حال اور مستقبل خاکستر ہو گیا ہے آپ کے تجربوں میں۔"

شیخوپورہ کا وہ فارم ہاؤس اس کی سسکیاں سنتا رہا۔

اس رات نیند کی گولی کھاتے ہی رئیس خان زادہ نے اپنے باپ رؤف خان زادہ کو پیغام لکھا تھا۔

"مجھے کینیڈا میں رہنا ہے۔ کاروبار کے لیے رقم میرے پراپرٹی میں حصے سے ایک ڈالر بھی کم نہ ہو۔"

ظفر خان زادہ اس کے دادا نے بھی فالج زدہ ہونے سے پہلے اپنی وصیت میں ساری جائیداد رئیس کے نام کی تھی اور اپنے بیٹے رؤف کو رئیس کی بات ماننے کا کہا۔

جب وہ فالج زدہ...... وہیل چیئر پر بیٹھے دادا کو لے کر وار نیک شائر میں ہوٹل بنانے آیا تو دس سالوں نے اسے بہتر سے بہترین کر دیا۔

☆☆☆

اخروٹ سے بنے گھر میں کتنے ہی قدم دھمکے، کتنی ہی آوازیں گونجیں۔ ملازم ہر تاریک گوشے میں جگنو بھرتے پھرتے۔ وہ چھ بچے جو امریکہ سے بڑے بے نیاز سے آئے تھے۔ اب گھر کو روندتے جاتے، کھاتے، کھیلتے۔ ظفر خان زادہ کی آٹو وہیل چیئر ایک کونے میں اس عورت کے سامنے تھی، وہ کہہ رہے تھے۔

"میرا ماننا ہے کہ محبت کے اگر پاؤں ہوتے تو بلی کی خصلت کے ہوتے۔ حرکت کرتی چپ والے، بے خبری میں چاٹ جانے والے۔ رئیس خان زادہ بھی محبت کی بے آواز چال کو بروقت سن نہ سکا۔ کچھ میرے جیسے استاد نے اسے فلسفوں میں ایسا الجھایا کہ وہ مشکلوں کو پار نہیں بلکہ توڑ کر باہر نکلا۔ ہاں مگر میں گواہ ہوں اس کے ہر اطلاعی گھنٹی یا فون کی گھنٹی پر چونک جانے کا۔ کسی گھنگھریالے سرخ بالوں والی یا گہری سبز آنکھوں والی کو بار بار دیکھنا مجھے یاد ہے۔ مجھے خبر ہے اس کے روابط کی جو مسز کرنل سے کرنل صاحب تک ہی محدود رہ گئے۔

میں شاہد ہوں اپنے پوتے کی ویران زندگی کا۔

ام ہالہ! میں تم سے تمہیں مانگتا ہوں اپنے پوتے کے واسطے۔ وہ امریکہ سے لوٹا تو یقین مانو وہیں کہیں رہ گیا۔ اس کے اسسٹنٹ نے تمہارا کارڈ مجھے دیا اور کہا وہ سنہری بالوں والی لڑکی میں ہی کچھ راز ہے سر! جانے مجھے کیوں لگا کہ زندگی ہمیں ہالہ سے دوبارہ ملوانے والی لگی ہے اور اس بار میں خود اس سے یہ کہنے والا ہوں کہ میرا پوتا تمہارے علاوہ کسی اور کا نہ ہو سکے گا۔"

ہالہ بس دیکھتی رہی اس بوڑھے شخص کا چہرہ۔ وہ دفتر سے لوٹا تو چہل پہل نے خاصا متاثر کیا۔ سیاہ و سفید فام چھ بچے۔ ڈرائنگ روم کی دہلیز پر وہ لاہور میں ارزاں ہوتا رئیس ہو گیا کہ سامنے والے کی مسکراہٹ فقیر کر دے۔

چیری کے پودے پر چھوٹی چھوٹی مصنوعی روشنیاں بندھی تھیں۔ بچے مختلف ڈیزرٹ چکھتے اور کچھ دادا کو چکھاتے۔

"ہالہ! تم اس عمر میں...... شتر مرغ کے گھونسلے سے بال لیے اگر کسی کو شادی کے لیے منا بھی لو گی تو تمہارے یہ چھ بمبارس بے چارے کی ہاں حلق میں ہی دبا کے منہ چاکلیٹ سے بھر دیں گے۔ تم کوئی ایسا ڈھونڈو، جوان بچوں کا منہ ہی بھرا رکھے۔"

وہ سرگوشیاں کرتا، ہالہ مسکرائی۔

"تمہیں معلوم ہے رئیس! تم تین بار باتوں ہی باتوں میں مجھے پروپوز کر چکے ہو۔"

"تو تم ہاں جو نہیں کرتیں۔ ویسے یہ بال کب رنگ بدل کے اصل رنگ میں لوٹیں گے؟"

ہاں اس نے ابھی بھی نہیں کی کیونکہ اسے یقین تھا کہ رئیس جانتا ہے، ناں کبھی بھی نہیں تھی۔ ان تینوں نفوس نے زندگی سے اپنے حصے کا سبق سیکھ لیا تھا۔ ہالہ نے مرتے مرتے جینے کا...... رئیس نے انسان ہونے کا اور ظفر خان زادہ نے بندگی کا۔

فضا میں دھند اٹھ رہی تھی اور ظفر خان زادہ کے کمرے سے سورۃ رحمٰن کی قرأت بھی۔

☆